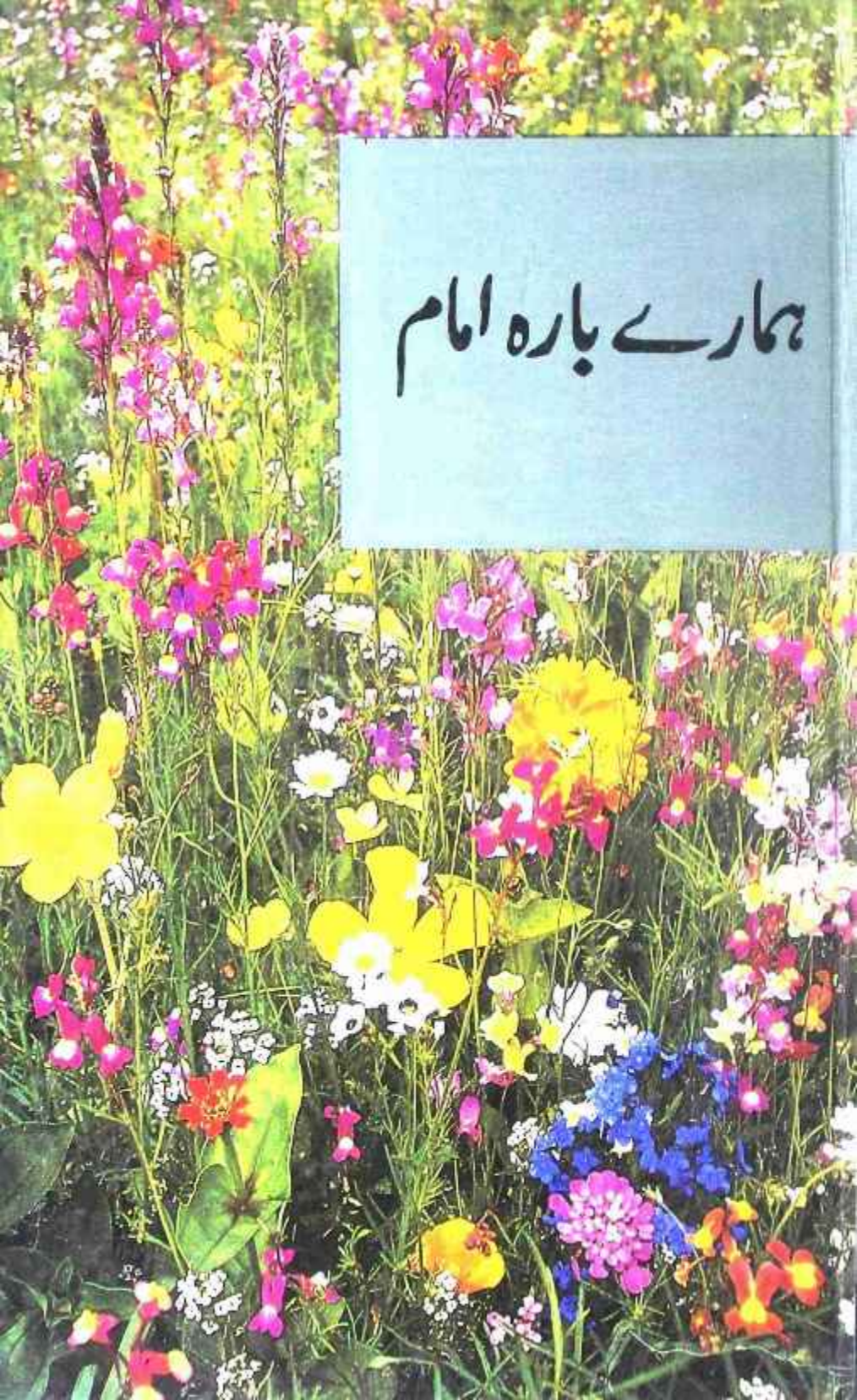
ہمارے بارہ امام

NAJAFI POOK LIBRARY
PH. 7211795

ACC No. 10529 .... Date 25/07/07
Section .... Status ....
D.D. Class ....
NAJAFI BOOK LIBRARY

ہمارے بارہ امام

جلد اول

مقدس زندگی.....پاک سیرت اور عظیم کارنامے

تصنیف

ہاشم معروف الحسینی (لبنان)

ترجمہ و تلخیص

سید محمد قرۃ العین عابدی

ناشر

زہراؑ اکادمی

کراچی - قم - برمنگھم

جملہ حقوق محفوظ

☆☆☆

نام کتاب	ہمارے بارہ امام
تصنیف	ہاشم معروف الحسینی (لبنان)
ترجمہ	سید محمد قرۃ العین عابدی
سال اشاعت	۱۹۹۱ عیسوی
تعداد	دو ہزار
ناشر	زہرا اکادمی کراچی - قم - برمنگھم

فہرست

شمار	مضمون	صفحہ
۱-	ابتدائیہ	۵
۲-	تعارف	۸
۳-	مقدمہ	۱۰
۴-	تمہید	۱۸
۵-	بارہ امام قریش سے ہیں	۴۱
۶-	ام المومنین حضرت خدیجہ بنت خویلد	۵۱
۷-	حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام	۵۸
۸-	حضرت فاطمہؑ اور مدینے کی طرف ہجرت	۶۴
۹-	حضرت امیر المومنینؑ سے آپ کی شادی	۶۸
۱۰-	حضرت فاطمہؑ فتح مکہ میں	۷۷
۱۱-	مصحف فاطمہؑ علیہا السلام	۸۰
۱۲-	حضرت فاطمہؑ اور آنحضرتؐ کی بیماری	۸۳
۱۳-	خلافت اور میراث کے بارے میں آپ کا نقطہ نظر	۸۸
۱۴-	فدک کے بارے میں	۹۲
۱۵-	حضرت زہراؑ کا خطبہ مسجد نبوی میں	۹۹
۱۶-	جناب سیدہؑ کی علالت	۱۰۸
۱۷-	امیر المومنین حضرت علی ابن ابیطالب علیہ السلام	۱۱۴

شمار	مضمون	صفحہ
۱۸-	علیؑ اور دعوت اسلام	۱۲۰
۱۹-	علیؑ شعب ابو طالب میں	۱۲۷
۲۰-	علیؑ ہجرت کی رات میں	۱۳۰
۲۱-	علیؑ اور اخوت	۱۳۶
۲۲-	علیؑ بوتراب	۱۳۹
۲۳-	علیؑ جنگ بدر میں	۱۴۳
۲۴-	علیؑ جنگ احد میں	۱۵۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابتدائیہ

حمد ہو اس ذات پر کہ جس کو تمام حمد اور ساری تعریفیں زیب دیتی ہیں اور درود ہو ان ہستیوں پر جو انسانیت کی تکمیل تھے اور رہتی دنیا تک انسانیت کے ہادی اور پیشوا ہیں۔

یوں تو سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ کی آل اور عترت طاہرہ پر قلم اٹھانا ثواب کا کام اور فریضے کی ادائیگی ہے لیکن ایک ایسے دور میں جب جہالت (Fallacy) کا دور دورہ ہو' جب کفر آمیز کتابیں نئی نئی زبانوں اور نئے نئے افسانوں کا لبادہ اوڑھ کر دوسرے ملکوں سے امپورٹ (Import) ہو رہی ہوں اور اردو ادب میں اہل بیت کی سیرت پر کتابوں کا فقدان ہو' جب قوموں کو سدھانے کے لئے جدید ورلڈ آرڈر آرہے ہوں' وہاں خالص محمدیؐ اسلام کو پھیلانے کی کوشش بارگاہ ربوبیت

میں ضرور ایک محبوب عمل اور پسندیدہ اقدام ہوگی۔

اس کتاب کو پیش کرکے ہم نہ کسی کی توہین کرنا چاہتے ہیں اور نہ ہی کسی کے جذبات کو مجروح کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ بلکہ تاریخ اور وہ بھی مستند تاریخ کے آئینہ میں اہل بیت اطہارؑ کی سیرت اور ان کی حیات طیبہ پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا جہاں کہیں بھی تاریخ میں اختلاف ہو یا حوالے کمزور اور غیر صحیح ہوں' مصنف نے نہایت دیانتداری سے وہاں اقوال اور مختلف احتمالوں کو منعکس کیا ہے اور انصاف سے رائے قائم کرنے کی کوشش کی ہے' یہی وجہ ہے کہ ان کی تمام تصنیفات حقیقی انداز سے سوچنے پر مجبور کردیتی ہیں اور دانشمند اور پڑھا لکھا طبقہ انہیں اور ان کے کام کو اچھی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس لئے کہ ہمارا سرمایہ ہماری تاریخ اور ہماری احادیث کے مجموعے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کتاب خالصتاً ایک علمی اور تحقیقی کام ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ معتبر کتابوں کے ذریعہ سے حقائق کو سمجھنے کی ایک علمی کوشش ہے۔

اس کتاب سے ثابت ہوتا ہے کہ آئمہ معصومین جو کہ اسلام کے حقیقی محافظ اور اسے باقی رکھنے کے ذمہ دار تھے' صرف ان کی سیرت پر عمل کرکے اور انہیں مشعل راہ بناکر ہم صحیح مسلمان اور اچھے انسان بن سکتے ہیں۔ اور یہ چیز بھی انہی کے دامن سے ملی ہے کہ اسلام کی خدمت ہر فرض اور ہر ذمہ داری پر فوقیت رکھتی ہے۔

مصنف نے جن کا تعلق لبنان سے ہے' اس کتاب میں بارہ اماموں کی سیرت پر قلم اٹھانے کی ہمت کی تھی لیکن جناب ختمی مرتبت کی پہلی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا اور دختر گرامی رسول جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی بیش بہا خدمات کے پیش نظر' ان دو مقدس ہستیوں کے بارے میں بھی لکھنا ضروری سمجھا۔ اس کتاب کو انہوں نے دو ضخیم جلدوں میں قلمبند کیا تھا۔ البتہ ہم اس میں سے پہلی

جلد کے آدھے حصہ کو ہی پیش کرسکے اور اگر حیات رہی اور معصومین علیہم السلام کی خاص عنایات شامل رہیں تو عقیدت مند قارئین اور اہل بیت سے سچی محبت رکھنے والوں کی خدمت میں باقی حصہ بھی پیش کریں گے۔

اب سے تقریباً پانچ سال پہلے ہمارے استاد گرامی قدر نے اس طرف ہماری توجہ دلائی تھی جب ہم عربی سے نابلد تھے اور انہی کی رہنمائی اور مسلسل معاونت سے ہم اس کام کو آگے بڑھاتے رہے۔

اس سلسلہ میں ہم استاد الاساتید حضرت آیت اللہ حاج سید ابن حسن نجفی مدظلہ العالی کے بھی تہہ دل سے مشکور ہیں جنہوں نے ہمیں قلم کی لطافت اور زبان کی ظرافت سکھائی۔ اور متعدد جگہوں پر خود بھی اپنے مبارک قلم سے عبارتوں میں خوبصورتی اور روانی پیدا کی۔

ہم نے اس کتاب میں پوری کوشش کی ہے کہ مفاہیم کو صحیح انداز میں منعکس کرکے ان کا خلاصہ (Summary) پیش کریں تاکہ محترم پڑھنے والے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ فیض حاصل کرسکیں۔

پالنے والے سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو اہل بیتؑ سے نزدیک ہونے کا ایک وسیلہ بنادے تاکہ ان کے دروازے پر آکر "مدینۃ العلم" یعنی علم کے شہر میں قدم رکھیں اور اسلام محمدیؐ سے آشنا ہوں۔

اور جو لوگ بھی اس راہ میں اخلاص سے کوشاں ہیں پروردگار عالم ان کی کوششوں اور خدمات کو قبول کرے اور حضرت بقیۃ اللہ ان سے راضی و خوشنود رہیں۔ والسلام علیکم و رحمۃ اللہ

سید محمد قرۃ العین عابدی
۱۹ ربیع الاول ۱۴۱۲ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

الحمد للہ رب العالمین والصلواۃ والسلام علی اشرف خلقہ خاتم رسلہ وعلیٰ آلہ الھداۃ المیامین

سچی بات یہ کہ حضور رسول مقبول کے خدا پسند جانشینوں کی زندگی ہدایت کی جاگتی ہوئی مثال اور طہارت کی روشن علامت ہے۔

اور اس موضوع پر قلم اٹھانے والے وہ لوگ ہیں جو قافلہ بشری کی راہوں میں کمال اخلاص کے ساتھ چراغاں کرتے ہیں! کوثر چھلکاتے ہیں!

پھر ہاشم معروف الحسینی جیسے صاحب طرز اور ہوش مند لکھنے والوں کا کیا کہنا! یہ ذہن بناتے ہیں اور فکر کی کاشت کرتے ہیں!

ہاں! ہمکتا ہوا ذہن! لہکتی ہوئی فکر!

یہ دانشور جن کا ابھی ذکر ہو رہا تھا۔ بڑی قد آور شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے آئمہ معصومین علیہم السلام کی زندگی، حالات اور کارناموں پر جو کام کیا ہے وہ اپنی ہمہ گیر افادیت کے لحاظ سے پڑھنے کی شئے اور سمجھنے کی چیز ہے!

مگر یہ قیمتی ذخیرہ عربی میں تھا اور اردو داں طبقہ اس سے بہرہ مند نہیں ہو سکتا تھا۔

اللہ سلامت رکھے فاضل جلیل اور جرنیل جناب مولانا سید محمد قرۃ العین صاحب عابدی کو جنہوں نے اس بیش بہا کاوش کو اردو میں منتقل کر کے ایک بہت بڑے طبقے کیلئے ایک اچھی بلکہ بہت اچھی پیش کش کے مطالعے کا بندوبست کر دیا۔

کتاب کا ترجمہ بہت رواں تفہیم کا انداز نہایت حسین اور تقدیم کا اسلوب حد درجہ پرکشش ہے۔

خدا کرے کہ یہ جواں سال دانشور ہمیشہ اتنے خوبصورت کارنامے انجام دیتے رہیں اور سدا کامیابیاں ان کے ہر شاہکار کا استقبال کریں۔ واللہ ولی التوفیق

خادم العلم و الشریعہ

ابن حسن نجفی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

حمد و ثناء اور صلواۃ و سلام کے بعد یہی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں ایک عرصہ سے آئمہ اطہارؑ کی سیرت طیبہ پر قلم اٹھانے کے بارے میں سوچ رہا تھا اور اس بات کا متمنی تھا کہ جلد از جلد یہ سعادت پاؤں! جس زمانے میں' میں سیرت النبی صلی اللہ علیہ و آلہ کی تدریس و تدوین میں مشغول تھا اسی دوران مجھے یہ انکشاف ہوا کہ

"جن لوگوں نے بھی اسلام کے ابتدائی دور میں اسلامی آثار کو جمع کیا ہے دراصل انہوں نے تاریخی واقعات اور حقیقتوں کو اپنے مذہبی جذبات کا آئینہ بنایا ہے۔ اور اس دور کی سیاسی حکومتوں کا ساتھ دیا ہے جس زمانے میں حکومتوں کو ایک خاص قسم کی دینی سیاست نے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا! میں اس نتیجے کے صحیح ہونے پر یقین رکھتا ہوں اور اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے سیرت النبیؐ کے شروع سے آخر تک کے تمام عناوین کو اسی مطابقت سے تحریر کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

اس تدریس کے بعد میں ان افکار و نظریات کا موجد بن چکا تھا جنہیں میں نے تاریخی واقعات اور اس دور کے خاص حالات و شرائط سے اخذ کیا تھا۔ لیکن یہ نظریات میرے قارئین کے لئے بالکل نئے تھے!

اگرچہ میں جانتا ہوں کہ ایک ایسے موضوع کے بارے میں انسانی عقیدے سے وابستہ ہونا' میانہ روی اختیار کرنا اور غلطیوں سے دور رہنا آسان کام نہیں' لیکن اتنا بتاتا چلوں کہ میں نے ان تمام تاریخی واقعات اور ان کے بارے میں قائم کئے جانے والے نظریات میں ہرگز جانبداری سے کام نہیں لیا۔

سیرت النبیؐ کی تدوین سے فارغ ہوتے ہی میں دوبارہ اس سوچ میں پڑگیا شاید اس لئے کہ میں نے اپنے آپ کو آئمہ اطہار علیہم السلام کی سیرت لکھنے کے لئے وقف کردیا تھا۔ موضوع دراصل جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ کی سیرت کی تکمیل تھی اور پھر حضورؐ اور آپ کے گھروالوں کے حق کی ادائیگی بھی ضروری تھی۔

ہمارے اماموں کو اسلام کے ابتدائی دشمنوں کی اولاد نے بے شمار تکلیفیں دیں۔ اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے اماموں نے بھی ابوسفیان' حکم ابن عاص' عباس ابن عبدالمطلب کی نسلوں اور تمام ظالم و جابر اور دوغلے حکمرانوں کے ساتھ وہی رویہ اپنایا جو سلوک ان کے جد امجد صلی اللہ علیہ وآلہ نے قریش کے سرغنوں' مکہ کے چودھریوں اور بنی قریظہ کے یہودیوں کے ساتھ روا رکھا تھا۔ آئمہ اطہار نے لوگوں کو بندگی و آزادی' تنگدستی و بے نیازی' ظلم و انصاف' علم و جہالت اور جنگ و امن کے معنی سمجھائے اور عملی زندگی میں ہمیشہ مظلوموں' محروموں اور نیک لوگوں کا ساتھ دیا۔ ساتھ ساتھ انہوں نے بہترین عالم' بہترین انسان' بہترین حاکم اور بہترین معاشرہ ایجاد کرنے کے لئے مقابلہ کی بنیادیں ڈالیں تاکہ شریعت کو ظلم و غلامی کی طوق سے

آزاد کراسکیں۔ انہوں نے زندگی کی مشکلات کا حل اس نسخہ کیمیاء سے کیا جو ہر زمان و مکان میں اپنی تاثیر باقی رکھتا ہے اور علم و دانش اور کمالات کے وہ آثار چھوڑے جو بڑی بڑی کتابوں میں بھی نہیں سماسکتے! یہ ورثہ جہاں کہیں اور جس حالت میں بھی ہو' نہایت کثرت کے ساتھ موجود ہے۔ یہ تمام چیزیں ان کے لئے کوئی بڑی بات نہ تھی کیونکہ انہوں نے اسے جناب امیر علیہ السلام سے حاصل کیا تھا اور جناب امیرؑ کو یہ ورثہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ کی جانب سے ملا تھا۔ شہر علم نے ان (علیؑ) پر علم کے ہزار دروازے کھول دیئے تھے اور ساتھ ہی انہیں قرآن مجید کا نظیر اور شبیہ قرار دیا تھا اور بتایا تھا کہ یہ دونوں (علی اور قرآن) ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر میں ان کے پاس پہنچ جائیں۔ اور یہ کہ قرآن میں ہر چیز کی وضاحت ہے۔

معصومین علیہم السلام کو حکام وقت کی طرف سے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ایذاء رسانی کا یہ سلسلہ اس شدت سے جاری رہا جو یا تو ان کی شہادت یا اسیری و نظربندی پر ختم ہوا۔

اس کے علاوہ انہیں اپنے شیعوں کی صفوں میں رہتے ہوئے بھی ان دشمنوں کا سامنا تھا جو ان کی بساط الٹنے اور اسلامی تعلیمات کو بدعتوں اور افسانوں میں بدلنے کے درپے تھے اور ان نادان دوستوں کا بھی جنہوں نے آپ حضرات سے وہ کام منسوب کئے جنہیں آپ نے انجام نہیں دیا یا وہ باتیں کیں جو یہ خود اپنے بارے میں کرتے تھے۔

رسالت کے یہ حقیقی وارث دونوں قسموں کے افراد کا جائزہ لیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"خدا کی قسم خوارج اور ہم سے بد زبانی کرنے والے ہمارے اتنے دشمن نہیں جتنے وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہمارے بارے میں وہ بات کہی جو ہم خود نہیں کہہ سکتے"۔

آئمہ معصومین علیہم السلام ہماری رہنمائی یوں فرماتے ہیں۔

"اگر کوئی بات ہماری طرف سے کہی جائے جو لوگوں کے بارے میں امکان پذیر ہو لیکن تم اسے نہ جانتے ہو اور نہ ہی تم نے اس پر غور و فکر کیا ہو تو اس کا انکار نہ کرو بلکہ اسے ہم سے منسلک کردو۔

"لیکن اگر کوئی ایسی چیز ہم سے منسوب کی جائے جو خلق خدا کے حق میں ممکن نہ ہو تو اسے جھٹلادو اور ہماری طرف نہ پلٹاؤ"۔

اس سلسلہ میں مجھ ناچیز کی رائے یہ ہے کہ راویوں نے جو کچھ اہل بیت علیہم السلام سے روایت کیا اور ان کی گفتار و کردار کو سچی نیت کے ساتھ جس طرح تحریر و تدوین کیا اسے دیکھ کر ہمارے مظلوم و بیکس امام شاید اپنی قبروں میں بھی تڑپتے ہوں گے کیونکہ ان روایت کرنے والوں نے اتنی چھان بین اور جستجو نہیں کی کہ سیاہ سفید کو الگ کرسکیں ـــــ اگرچہ ان لوگوں نے قابل تحسین خدمات بھی انجام دیں ہیں لیکن ساتھ ساتھ اسلام دشمنوں کے ہاتھ میں ہتھیار بھی دیدیئے تاکہ وہ آسانی سے زہر پاشی کریں اور شیعہ عقیدے کو انتشار کا نشانہ بنائیں۔ یہ زہریلے آثار ان دشمنوں کی شروع سے آخر تک کی کتابوں میں نہایت وضاحت کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ بہرحال اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ کام انہوں نے اچھی نیت سے کیا ہو یا بری نیت سے مگر جو کچھ شیعہ فرقے اور ان کے اماموں سے چپکایا گیا اس میں تکیہ انہی احادیث پر کیا ہے جو ہماری بڑی اور جامع کتابوں میں موجود ہیں۔ وہی کتابیں جنہیں ہمارے تاجر حضرات نئے نئے انداز اور سنہری الفاظ میں چھاپنے پر کمربستہ رہتے

ہیں لیکن اس میں موجود ان روایتوں سے غافل ہیں جو ہمارے اماموں کے مراتب و درجات کے مطابق نہیں ہیں۔

اس زمانہ کے لوگ درکنار خود عصر حاضر کے لکھنے والے بھی جب آئمہ کی سیرت پر قلم فرسائی کرتے ہیں تو بس آنکھیں بند کرکے لکھنا شروع کردیتے ہیں!

معاشرتی قدروں میں انقلابی تبدیلیاں آنے کے بعد آج کا انسان اپنی سوچ اور جہاں بینی میں اس دور کے انسان سے خاصا مختلف ہے۔ لہٰذا ضروری نہیں کہ کسی شخصیت کی عظمت کا تعارف صرف ان ہی طریقوں سے کرایا جائے جو اس وقت کا دستور تھا۔ بلکہ اگر صرف واقعات اور ان سے باقی رہنے والے آثار کی روشنی میں ان کی حیات طیبہ کا جائزہ لیا جائے تو یہ کام کہیں زیادہ ان کی شان و شوکت کا بیان گر ہوگا۔

لہٰذا اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ ان کی سیرت کے بارے میں بحث کرنے والا ان کی زندگی اور ان کے چھوڑے ہوئے آثار سے کمالات کی بڑی مثالی منزلوں کی نشان دہی کرسکتا ہے۔ اگر شیعوں کے علاوہ دوسرے لوگوں کے پاس حضرت علیؑ اور باقی امام ہوتے تو وہ کائنات کو ان کی خوبیوں اور ان کی یادوں سے چھلکا دیتے۔ اور ان کی حیات طیبہ کے اسرار و رموز سے ایک نئی دنیا بناڈالتے!

شیخ جنفاوی اور شیخ خضیری اپنی کتابوں میں رقم کرتے ہیں کہ ابوسفیان کے بارے میں جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ کا یہ کہنا کہ "جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوگیا وہ امان میں ہے" ——— اس کے لئے اتنا بڑا شرف ہے جو کسی اور کو نصیب نہیں ہوا ———

حالانکہ اگر کوئی شخص سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ کا تھوڑا سا مطالعہ بھی کرتا

ہو اور دعوت اسلام کی تبلیغ میں سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ کی روش کو ذرہ برابر بھی جانتا ہو تو وہ اچھی طرح سمجھ سکے گا کہ آنحضرتؐ نے یہ جملہ خاص موقعہ پر کہا تھا تا کہ قریش کو خون خرابہ سے روکا جاسکے ـــــــ مزید یہ کہ آپؐ نے اسی وقت یہ بھی فرمایا تھا کہ "جو حکیم ابن حزام کے گھر میں پناہ لے وہ امان میں ہے' جو اپنا ہتھیار پھینک دے وہ امان میں ہے اور جو اپنے گھر جاکر اندر سے دروازہ بند کرلے وہ بھی امان میں ہے۔ ـــــــ لیکن اس کے باوجود بھی جفاوی اور خضیری کو اور سواد اعظم کے بعض مشائخ کو صرف ابوسفیان ہی میں وہ خوبی دکھائی دیتی ہے کہ جس سے وہ مولائے متقیان تک کو محروم کردیتے ہیں جبکہ شیعہ سنی اپنے پورے اتفاق کے ساتھ حضرت علی علیہ السلام کے فضائل میں کیا کچھ نہیں بیان کرتے؟ ـــــــ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ نے امیر المومنین کو فتح مکہ کے دن اپنے کندھوں پر چڑھایا تاکہ ان بتوں کے ٹکڑے کردیں جنہیں ابوسفیان پوجتے تھے اور پوجتے رہے یہاں تک کہ کفر کی موت مرے۔!

بہرحال اللہ تعالیٰ نے مجھے توفیق دی کہ اپنی ناقص صلاحیتوں اور محدود وسائل کے ساتھ آئمہ اطہار کی سوانح حیات کے کچھ گوشوں پر روشنی ڈالوں اور اب جبکہ میں اس کام سے فارغ ہوچکا ہوں تو آنسوؤں کے ساتھ سعادت پانے کا ایک جذبہ بھی امنڈ آتا ہے۔ کیونکہ ان کی زندگی خدا کی یاد دلاتی ہے اور مردہ دلوں کو اسی طرح زندہ کرتی ہے جس طرح سے رحمت کی بارش بنجر زمینوں کو سرسبز کردیتی ہے ـــــــ اور جتنا ہر شخص ان کی زندگی سے متاثر ہوتا ہے اور ان سے علم کی بھیک مانگتا ہے اتنا ہی وہ عظمت و وجاہت حاصل کرتا ہے۔

ہم ہر دور میں سینکڑوں شیعہ علماء اور دانشمند حضرات کو دیکھتے ہیں جنہوں نے اہل

بیت کی شان و شوکت کے آگے اپنا سر تسلیم خم رکھا ہے اور وہ تمام علوم کی تاریخ کو اہل بیت علیہم السلام سے منسلک کرتے ہیں۔ اگر یہ لوگ مکتب جعفری سے تعلق نہ رکھتے اور اس مکتب کے اماموں کے گرویدہ نہ ہوتے تو ہرگز یہ مقام و منزلت نہ پاتے اور ناچیز ہی رہتے۔

میں نہ تو سرے سے کوئی نئی چیز لانے کا ادعاء کرتا ہوں اور نہ ہی یہ کہتا ہوں کہ مجھے ان کی حیات طیبہ کے تمام گوشوں پر احاطہ ہے! اور ان کی زندگی کے گوشوں سے واقف ہوں۔ کیونکہ تفصیلی علم تو صرف خاص بندوں ہی کو میسر ہے۔ البتہ جتنا جاننے اور سمجھنے کی مجھے توفیق بلی استطاعت کے مطابق اسے پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہوں۔ اس سیرت طیبہ کے بارے میں جو میرا نقطہ نظر ہے اسے میں نے اس کتاب میں تحریر کردیا ہے۔ اور کوشش یہ کی ہے کہ اختصار سے کام لوں لیکن تاریخی واقعات اور سیاسی حالات (جو ہمارے اماموں کی زندگی میں اہمیت کے حامل ہیں) جنہیں مؤرخین کی تحریفات نے ہمیں مجبور کردیا کہ ان مقامات پر قدرے تفصیل سے بحث کی جائے۔ وہاں قلم کو آزادی دینا پڑی اور شاید اسی لئے یہ سیرت دو جلدوں تک پھیل گئی۔

کتاب کا آغاز حضرت خدیجہ کے مختصر حالات زندگی سے کیا گیا ہے اس لئے کہ وہ آنحضرت کی پہلی باوفا ساتھی اور شریک حیات تھیں اور پھر انہوں نے جان و مال کے جو نذرانے اسلام کو پیش کئے اور جس طرح سے مسلمانوں کی خدمت کی اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کی قدردانی نہ کرنا شاید صحیح نہ ہو۔

اس کے بعد ہم ان کی منفرد صاحبزادی جناب سیدہ کے بارے میں گفتگو کریں گے جنہوں نے اپنی والدہ کی طرح اسلام اور پیغمبر اسلام کی خدمت پر کمر باندھی اور اپنی

والدہ کی وفات کے بعد اپنی تمام توانائیاں اس کام میں صرف کردیں۔

اس کے بعد ہم اپنی بحث کا باقاعدہ آغاز کریں گے اور انشاء اللہ بارہ اماموں کی سیرت پر گفتگو ہوگی۔!

اب جبکہ میں معصومین علیہم السلام کی زندگی کے تاریخی لمحات کو قلم بند کرکے ان کی خدمت اقدس میں پیش کررہا ہوں تو مجھے کبھی حضرت یوسف کے بھائیوں کا وہ مقولہ یاد آجاتا ہے جو انہوں نے مصر پہنچ کر خدا کے پیارے نبی حضرت یوسف سے کہا تھا کہ'

"حضور والا ہم اور ہمارے گھر والے بہت تکلیف میں ہیں اور ایک ناچیز سی پونجی لے کر آئے ہیں لہٰذا آپ غلہ تلوا دیجئے اور اپنی بخشش سے محروم نہ کیجئے۔ خداوند عالم بخشش کرنے والوں کو جزائے خیر دیتا ہے"۔

اور کبھی شاعر کا وہ شعر یاد آجاتا ہے۔

"اے اہل بیت زندگی میں تم ہی میرا سہارا ہو
اور آخرت میں تم ہی میری پناہ ہو !

میں نے قیامت کے لئے تمہاری سچی محبت اور حسن اعتقاد کے علاوہ کچھ جمع نہیں کیا۔

حمد ہو اس خدائے پاک پر کہ جس نے ہمیں ہدایت کی اور اگر اس کی رہنمائی نہ ہوتی تو ہم ہرگز ہدایت پانے والوں میں نہ ہوتے!

مصنف

ہاشم معروف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

اس حقیقت کا اعتراف تمام مورخین اور محدثین کو ہے کہ لفظ "اہل بیت" کتاب و سنت میں بعینہ لغوی معنی میں استعمال نہیں ہوا اس بارے میں شیعہ علماء اور اہلسنت کے زیادہ تر دانشور حضرات کی رائے یہ ہے کہ یہ لفظ محدود معنی میں استعمال ہوا جس سے مراد چہار دہ معصومین علیہم السلام ہیں۔ اس کے برخلاف کچھ ایسے افراد بھی ہیں جو کتاب و سنت میں پائے جانے والے اس لفظ کے تمام قرینوں اور مناسبتوں سے چشم پوشی کرکے صرف لغوی مفہوم پر اٹک جاتے ہیں۔ ان مناسبتوں سے ثابت ہوجاتا ہے کہ اہل بیت سے مراد یہی پاک و پاکیزہ ہستیاں ہیں لیکن ان افراد کے پاس جو اسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ کی ازواج کی شان میں نازل کرنا چاہتے ہیں کوئی ٹھوس دلیل نہیں!

اسی پر کیا موقوف ان لوگوں نے تو امیر المومنین علیہ السلام کی شان میں اترنے والی ہر حدیث کی تاویل کی اور توجیہات کے وہ دفتر کھولے کہ تاریخ شرما گئی۔

ہم آگے چل کر مولائے متقیان علیہ السلام کی سیرت میں تفصیل سے ان کا جائزہ لیں گے۔

اگرچہ زیادہ تر راوی اور مفسر حضرات کی نظر میں سورہ احزاب میں موجود لفظ "اہل بیت" سے مراد پنجتن پاک ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ نے اسے ہمیشہ ایک وسیع معنی میں استعمال کیا جس میں بارہ امام بھی آجاتے ہیں۔ وہی پاک ہستیاں جن کے زیر سایہ رہ کر اور ان کے دشمنوں سے برائت طلب کرکے ہی شیعہ شیعہ بن سکتے ہیں!

جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ کو نہ جانے کتنی دفعہ یہ کہتے سنا گیا کہ

"بے شک میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جارہا ہوں خدا کی کتاب اور میری عترت میرے اہل بیت۔ تم لوگ جب تک ان کا دامن مضبوطی سے تھامے رہوگے میرے بعد ہرگز گمراہ نہ ہوگے۔

بلکہ حضور صلی اللہ علیہ آلہ وسلم یہ بھی ارشاد فرماتے ہیں کہ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان دو چیزوں کے سلسلے میں کس طرح سے تم میری پیروی کرتے ہو"۔

اس میں بھی کسی کو شبہ نہیں کہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ نے اپنے اہل بیت کا تعارف خدا کی کتاب کے نظیر کی حیثیت سے کرایا ان معنی میں کہ جس طرح خدا کی کتاب بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھاتی ہے اسی طرح اہل بیت علیہم السلام بھی ہدایت کا وہ سرچشمہ ہیں جس سے پوری انسانیت فیض اٹھاتی رہے گی۔

ان کی راہ پر چلنے والا اس لئے گمراہ نہیں ہوسکتا کیونکہ ان کی گفتار و کردار قرآن

کی منہ بولتی تصویر ہے اور ان کا خلوص اور ان کی دیانت اسلام کا عملی نمونہ ہیں۔

یقیناً یہ معنی صرف انہی بارہ اماموں پر پورے اترتے ہیں جن کی شان و شوکت کو خدا کے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ نے واضح کردیا تھا مختلف موقعوں پر ان کے اسماء گرامی کی نشاندہی تک کر دی تھی ------ اس بات کی تصدیق شیعہ سنی تمام روایتیں کرتی ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ سنت نبوی صلی اللہ علیہ آلہ وسلم اس لفظ کو وسیع معنی میں استعمال کرنے میں قرآن کریم پر سبقت رکھتی ہے۔

اب جبکہ موضوع سخن بارہ اماموں کی سیرت سے ہے لہذا ہمیں چاہئے کہ فرقہ پرستی اور تعصب کو بالائے طاق رکھ کر انصاف سے اس کلمہ کا جائزہ لیں۔ اور کتاب و سنت میں اس کے استعمال کے موارد اور ان مناسبتوں کو ڈھونڈ نکالیں جو اس پر احاطہ کئے ہوئے ہیں تاکہ حقیقی معنی تک پہنچ سکیں۔

سورۃ مائدہ کی ۳۲ ویں آیہ شریفہ میں ارشاد باری ہوتا ہے۔

"اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ کی بیویوں تم وقار کے ساتھ اپنے گھروں میں بیٹھی رہو اور جاہلیت کے ابتدائی زمانہ کی طرح اپنے بناؤ سنگھار کی نمائش نہ کرتی پھرو اور نماز پڑھو زکواۃ دو اور خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ کی اطاعت کرو"۔

"اے اہل بیت! خداوند عالم تو بس یہ چاہتا ہے کہ تمہیں ہر قسم کی برائی سے محفوظ رکھے اور تمہیں اس طرح سے پاک کردے جو پاک کرنے کا حق ہے"۔

اس سے پہلے والی آیات میں بھی خطاب ازواج سے ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے۔

"اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ کی بیویوں تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو لہذا اگر

خدا سے ڈرتی ہو تو اتنی نرمی اور ملائمت نہ دکھاؤ کہ کسی بیمار کا دل للچا جائے اور پاک وصاف گفتگو کیا کرو"۔

اسی طرح بعد والی آیات بھی انہیں کے بارے میں ہیں کیونکہ قواعد کی رو سے جو ضمیر استعمال کی گئی ہے وہ صرف انہی پر منطبق ہوتی ہے۔ لہٰذا ۳۲ ویں آیہ شریفہ کا آخری حصہ (انما یرید ---------- تطہیرا") اوپر نیچے سے بالکل الگ ہے۔ اور اس سے مراد ازواج نہیں بلکہ وہ اصحاب کساء ہیں جنہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ نے اپنی چادر کے نیچے لے لیا تھا اگر اس سے مراد امہات المومنین ہوتیں تو قواعد اور سیاق وسباق کی رو سے عبارت کو یوں ہونا چاہیے تھا۔

انما یرید اللہ لیذھب عنکن الرجس و یطھر کن تطھیرا"

پھر خود آیہ شریفہ میں اس بات کو صراحت کے ساتھ بیان کردیا گیا ہے کہ حق تعالٰی نے " اہل بیت" کو ہر قسم کی برائی سے دور اور لغزشوں سے محفوظ رکھا۔ کلمہ "رجس" ان تمام خطاؤں اور گناہوں کے لئے کہا جاسکتا ہے جن میں خالق کائنات کی خوشنودی حاصل نہیں ہوتی۔ لہٰذا اس معنی میں تطہیر عصمت کے مترادف ہے۔ اور اس چیز پر تمام مورخ اور تمام راوی متفق ہیں کہ ازواج رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس عالی مقام پر فائز نہ تھیں۔!

نہ صرف یہ بلکہ وہ خود اپنی تاریخوں میں لکھتے ہیں کہ امہات المومنین نے متعدد مرتبہ خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ سے بے ادبی کی۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ نے پورے مہینہ کے لئے ان سے قطع تعلق کرلیا اور انہیں طلاق سے ڈرایا۔

تاریخ یہ بھی رقم کرتی ہے کہ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے ایک

زوجہ کے حجرہ کے سامنے کھڑے ہو کر فرمایا'

"فتنہ و فساد یہاں سے سر اٹھائے گا"۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم قریب تشریف لے گئے اور اس بار یہ جملہ ادا کیا'

"شیطان کے پیرو کار اور چیلے چانٹے یہاں سے برآمد ہوں گے"۔(۱)

سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ کی وفات کے بعد امہات المومنین کی سطح عام مومنات کی سطح سے بھی زیادہ گرتی دکھائی دیتی تھی۔ لہذا صالح بیبیوں کے لئے نمونہ بننا خاصا مشکوک دکھائی دیتا ہے۔ وضاحت یہیں خود آیہ شریفہ سے ملتی ہے۔ البتہ حضرت ام سلمہ ان سب سے مستثنیٰ ہیں اس لئے کہ انہوں نے فرمان الہی کی پیروی میں گھر سے باہر قدم نہیں نکالا اور اپنی طویل زندگی خالق و مخلوق کی خدمت میں وقف کردی۔ حالانکہ اسی دوران دوسری زوجات نے فتنہ و فساد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ایک نے مدینہ سے بصرہ تک ایک ایسے لشکر کی قیادت کی جس سے مسلمانوں کے امام اور خلیفہ کے خلاف بغاوت ہوئی اور لوٹ مار اور خون خرابہ کا بازار گرم ہوگیا۔

یہی وہ پہلی اندرونی سازش تھی جس نے معاویہ کو اتنی مہلت دیدی کہ شام والوں کو اپنے ساتھ ملا کر اور حضرت عائشہ سے گٹھ جوڑ کرکے اسلامی خلافت پر نظریں جمائیں۔ اور بی بی عائشہ کی جماعت کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلیفہ سے وہ خونی جنگ لڑے جس کی بھینٹ ہزاروں مسلمان چڑھ جائیں اور تاریخ کے صفحے ہمیشہ کے لئے داغدار ہوجائیں۔ اس تمام بحث کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ لوگ جنہیں خداوند کریم نے طہارت سے سرشار کیا وہی اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ ہیں جنہیں شیعہ معصومین علیہم السلام پر منطبق کرتے ہیں۔ اور سوائے چند کمزور اور بے بنیاد حواریوں

(۱) صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۱۸۹

کے کوئی یہ ادعاء نہیں کرتا کہ لفظ اہل بیتؑ سے کوئی اور مراد ہے! ہم ان کمزور دعوے داروں میں سے ایک ایک کا تذکرہ کرتے ہیں۔

پہلا شخص "عکرمہ" ہے۔ یہ عبداللہ ابن عباس کا غلام تھا اور کیونکہ جھوٹ بولنے' احادیث کے گھڑنے اور افکار و مکاتب کے ایجاد کرنے میں خاصی مہارت رکھتا تھا اس لئے یہ کام اس سے بعید نہیں۔

تاریخ اس شخص کے بارے میں رقم طراز ہے کہ اس نے خوارج کے ایک فرقے کی بنیاد رکھی۔ یہ ہمیشہ عبداللہ ابن عباس کے ساتھ رہا اور تمام چیزوں کو انہی سے منسوب کرتا رہا یہاں تک کہ عبداللہ کے صاحبزادے علی ابن عبداللہ اسے قید کرنے اور کوڑے لگانے پر مجبور ہوگئے۔!

اس مقولہ کا دوسرا طرفدار مقاتل ہے۔ یہ شخص علیؑ اور اولاد علیؑ سے دشمنی رکھنے اور انہیں برا بھلا کہنے میں مشہور تھا۔ امام نسائیؒ نے اسے حدیث گھڑنے والوں کے زمرے میں شامل کیا ہے۔

جوزانی نے اپنی کتاب میں اس دور کے خلفاء کی شان میں حدیثیں گھڑنے سے متعلق کچھ اس کے واقعات رقم کئے ہیں۔

ان دو افراد کی صورتحال واضح ہونے کے بعد یہ مقولہ باطل ہوجاتا ہے کہ اہل بیت سے مراد صرف زوجات النبی صلی اللہ علیہ و آلہ ہیں اور مزید بحث کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ نیستا" صرف دو مقولے باقی رہ جاتے ہیں ایک یہ کہ لفظ اہل بیت صرف علیؑ و فاطمہ اور حسن و حسین علیہم السلام سے مخصوص ہے جیسا کہ شیعہ علماء اور بہت سے سنی محدث کہتے ہیں دوسرا یہ کہ ازواج بھی اس ضمن میں آتی ہیں۔ کچھ سنی علماء اسی نظریہ کے قائل ہیں۔

اس بارے میں کچھ کمزور و بے جان اقوال بھی ملتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اہل بیتؑ سے مراد تمام بنی ہاشم ہیں۔ اگرچہ اس قسم کے اقوال کو "صحاح ستہ" اور اہلسنّت کی دوسری موثق کتابوں میں بڑے اعتماد کے ساتھ رقم کیا گیا ہے اور ان سے متعلق روایتوں کو بھی ضبط کیا گیا ہے لیکن ان تمام روایتوں کے کمزور ہونے کے علاوہ ہمیں جناب رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ سے ایسی احادیث بھی ملتی ہیں جو ان کی تردید کے لئے کافی ہیں۔

امام رازیؒ اپنی تفسیر میں رقم کرتے ہیں!

"اللہ تعالیٰ نے اس آیہ شریفہ میں ضمیر مئونث کا خطاب ترک کرکے مذکر کی ضمیر استعمال کی۔ تاکہ اہل بیتؑ میں ان کے گھر کے مرد و عورت دونوں شامل ہوسکیں۔ اگرچہ بہتر قول یہ ہے کہ اہل بیتؑ سے مراد ازواج و اولاد کے علاوہ حسین علیہم السلام اور فاطمہ ہیں اور علیؑ بھی اسی زمرے میں آتے ہیں کیونکہ وہ دخترگرامی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ کے شریک زندگی تھے۔!(۱)

ابن کثیر بھی اسی نظریہ کے حامیوں میں سے ہیں جبکہ مرحوم طبرسی اپنی تفسیر "مجمع البیان" میں جناب ابوسعید خدری، انس ابن مالک، واثلہ ابن اسقع اور حضرت عائشہ سے روایت کرتے ہیں کہ آیہ شریفہ صرف سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ، علی و فاطمہ اور حسنین علیہم السلام کی شان میں نازل ہوئی۔

وہ مزید یہ رقم کرتے ہیں کہ ابوحمزہ اپنی تفسیر میں شہر ابن حوشب کے حوالہ سے جناب ام سلمہ سلام اللہ علیہا سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

"ایک دفعہ جناب سیدہ علیہا السلام بارگاہ ختمی نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ میں کچھ کھانے پینے کی چیز لائیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ نے فرمایا کہ اپنے شوہر اور بچوں کو

(۱) تفسیر رازی جلد ۲۵ صفحہ ۲۰۹

بھی بلالو۔ جب سب آگئے اور اس چیز کو تناول کرلیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ نے ان سب پر چادر ڈالی اور یوں دعا کی:

"اے خدا یہ میری عترت اور میرے اہل بیت ہیں۔ بارِالٰہا تو انہیں ہر برائی سے دور کردے اور پاک و پاکیزہ بنادے"۔

حضرت ام سلمہ نے یہ سن کر بارگاہ رسالت میں عرض کی کہ اے خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ کیا میں بھی ان میں سے ہوں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ نہیں، لیکن تم نیکی اور بھلائی پر ہو۔

طبری مزید رقم کرتے ہیں:

"ثعلبی نے "درمنثور" میں تمام اسناد کے ساتھ جناب ام سلمہ سے روایت کی ہے کہ:"

"جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ حضرت فاطمہ زہراؑ کے گھر تشریف فرما تھے۔ وہ خورد ونوش کی کوئی چیز لیکر حاضر ہوئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ نے فرمایا کہ شوہر اور بچوں کو بھی بلا لایئے۔ ابھی وہ بلاکر لائی ہی تھیں کہ آیہ تطہیر نازل ہوئی۔

یہی ثعلبی مجمع نامی شخص سے روایت کرتا ہے جس میں وہ شخص کہتا ہے:

"میں اپنی والدہ ماجدہ کے ساتھ حضرت عائشہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اماں آتے ہی ان سے جنگ جمل اور حضرت امیرؑ کی مخالفت کے بارے میں پوچھ بیٹھیں۔ انہوں نے جواب دیا وہ خدا کی تقدیر تھی۔

پھر اماں نے خود حضرت امیرؑ کے بارے میں پوچھا تو حضرت عائشہ نے کہا:

"اس شخص کے بارے میں پوچھتی ہو جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کے

نزدیک محبوب ترین فرد تھا اور ان کی محبوب ترین بیٹی کا شوہر تھا۔ میں نے علی و فاطمہ اور حسنین علیہم السلام کو اس حال میں دیکھا ہے جب سرور کائنات نے انہیں چادر کے نیچے جمع کیا اور یہ ارشاد فرمایا۔

"پالنے والے یہ میرے اہل بیت ہیں۔ انہیں برائی سے پاک اور طہارت سے سرشار کردے"۔

میں نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کیا میں بھی آپ کے اہل سے ہوں۔ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ نے جواب دیا پیچھے ہٹو تم بھلائی پر ہو۔

ان روایتوں کے علاوہ محدثین کی ایک جماعت حضرت جابر ابن عبداللہ انصاری جیسے جلیل القدر صحابی سے روایت کرتی ہے کہ آیہ تطہیر اس وقت اتری جب گھر میں پنجتن پاک علیہم السلام کے علاوہ کوئی گھر میں نہ تھا۔

آیہ تطہیر کے اترنے کے بعد سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ نے یہ جملہ ادا کیا'

"بار الہا یہی میرے اہل ہیں"۔

صحیح مسلم میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ یمنی چادر اوڑھے ہوئے گھر سے نکلے تھے کہ امام حسن علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کے پاس حاضر ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ نے انہیں اندر کرلیا اور پھر باری باری امام حسین اور حضرت علیؑ و فاطمہ بھی اس چادر کے اندر آگئے اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ نے آیہ تطہیر کی تلاوت فرمائی۔

یہ حدیث ہمیں "تفسیر طبری" "بحر محیط" (اندلسی)' "سہیل" (حافظ) اور اس کے علاوہ دوسری تفسیروں میں اسناد کی کثرت کے ساتھ ملتی ہے اور حضرت عائشہ' حضرت

ابوسعید خدری، حضرت جابر ابن عبداللہ انصاری جیسے بڑے بڑے صحابہ کرام اسے روایت کرتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ اس حقیقت کا اعتراف کم و بیش تمام معتبر کتابیں کرتی ہیں کہ آیت تطہیر انہیں اصحاب حمہ کے بارے میں نازل ہوئی۔

اس زمرہ میں صحیح ترمذی، مسند امام احمد ابن حنبل، مستدرک الصحیحین، اسد الغابہ (ابن اثیر) کنزا لعمال (متقی) سنن بیہقی، مشکل الاثار (طحاوی)، تاریخ بغداد (خطیب بغدادی)، خصائص نسائی، ریاض النضرۃ (محب الطبری) "مجمع الزوائد" (ہیثمی)، موافقات، اربعین طوال (ابو قاسم) اور مسند داؤد آجاتی ہیں۔

ان کتابوں کے مصنف بڑے اطمینان اور وثوق سے لکھتے ہیں کہ آیہ تطہیر میں موجود لفظ اہل بیت سے مراد صرف اصحاب خمسہ ہیں۔

اگر ان تمام روایتوں سے بھی صرف نظر کرلیا جائے تب بھی جو نتیجہ احادیث کے تفسیروں اور سنت کے مجموعوں پر غور و فکر کرنے کے بعد نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ ہرگز حضور صلی اللہ علیہ وآلہ کی بیویاں یا ان کے چچا اور قبیلہ والے آیہ تطہیر کے مصداق نہیں قرار پاسکتے بلکہ اس لفظ سے مراد وہی ذریہ طیبہ ہے جس کے فضائل جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ نے مختلف موقعوں پر بیان کئے تھے۔

ان میں سے ایک حدیث ثقلین ہے جسے بارہا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ سے سنا گیا اور اس حدیث کے علاوہ بھی بہت سے ایسے موارد ہیں جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ خاص طور پر آیہ تطہیر کی تلاوت کرتے تھے تاکہ اہل بیتؑ کے معنی لوگوں کو سمجھا سکیں اور کسی کو شبہ بھی نہ ہو کہ کوئی اور بھی اس ضمن میں آتا ہے۔

ابوحمراء روایت کرتے ہیں کہ میں چھ مہینہ جناب خاتم النبین صلی اللہ علیہ وآلہ

کی خدمت میں رہا۔ اس تمام عرصہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ نماز ظہر کا وقت ہوتے ہی مولائے متقیان علیہ السلام کے دروازے پر آتے' نماز کی دعوت دیتے اور پھر آیہ تطہیر کی تلاوت فرماتے۔

اسی طرح عبداللہ ابن عباس سے مروی ہے کہ میں نے چھ مہینہ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ کو قریب سے دیکھا۔ ان کا معمول تھا کہ نماز کے وقت مولا کے دروازے پر آتے اور اس طرح سے سلام کرتے'

"السلام علیکم اہل بیت ورحمتہ اللہ وبرکاتہ"

پھر آیت تطہیر کی تلاوت فرماتے۔

پھر اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کہ سورہ احزاب کی ۳۳ ویں آیت (کہ آیت تطہیر جس کا ایک حصہ ہے) اور پہلی اور بعد کی آیات میں خطاب پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ کی اہلیاؤں سے ہے اس لئے کہ خود قرآن مجید میں ایسی بے انتہاء مثالیں موجود ہیں جن میں سیاق و سباق کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔

تفسیر "المنار" کے مصنف اپنے استاد شیخ محمد عبدہ سے یہ مقولہ نقل کرتے ہیں کہ:

قرآن شریف کی عادت ہے کہ انسان کو ایک مطلب سے دوسرے کی طرف منتقل کردیتا ہے اور دوبارہ پہلے کی طرف پلٹا دیتا ہے"۔(۱)

"مجمع البیان" جیسی معتبر تفسیر کے مصنف مرحوم طبرسی بھی اپنی تفسیر میں رقم کرتے ہیں کہ بزرگوں کا یہ معمول ہے کہ گفتگو کرتے وقت ایک بات سے دوسری کی طرف چلے جاتے ہیں اور پھر دوبارہ پہلی کی طرف پلٹ آتے ہیں۔ نیز قرآن مجید اور عربی کی نظم و نثر میں ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔

اسی سلسلہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ:

---

(۱) تفسیر "المنار" جلد ۲ صفحہ ۳۵۱

"قرآن مجید کی ابتداء ایک چیز سے ہوتی ہے اور انتہا دوسری پر۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قرآنی آیات میں صرف سیاق و سباق پر تکیہ کرنا صحیح نہیں بلکہ ہر آیہ شریفہ کا الگ الگ جائزہ لینا چاہئے اور اس کے ظاہری معنی و مفہوم کی مطابقت میں موجود تفسیروں کی طرف رجوع کرنا چاہئے لیکن اگر اس ضمن میں حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ یا آئمہ طاہرین کے کلمات ملتے ہوں تو انہیں پر اکتفاء کرنا چاہئے اگرچہ یہ سیاق و سباق اور ظاہری مفہوم کے خلاف ہوں۔"

پھر اکثر محدث اور مفسر حضرات نے آیہ تطہیر کو دلیل بنا کر ان تمام ہستیوں کی عصمت و طہارت پر استدلال کیا ہے جن پر یہ منطبق ہوتی ہے۔

ان لوگوں کا کہنا ہے کہ لفظ "انما" وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں بعد میں آنے والے جملہ کو تاکید کے ساتھ بیان کرنا ہو۔ اور اس کے واقع ہونے پر اصرار کرنا ہو پھر اس کے بعد مشیت اور ارادہ خداوندی کا آنا (یرید) اس بات کی وضاحت ہے کہ مراد ان گناہوں کی تطہیر ہے جنہیں کلمہ "رجس" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مزید یہ کہ اگر اہل بیت کے علاوہ دوسرے افراد بھی اس خوبی سے برخوردار ہو جائیں تو ان میں اور دوسروں میں کوئی فرق باقی نہیں رہے گا جبکہ آیہ شریفہ ان کی فضیلتیں اور امتیازات بیان کرنے کے لئے نازل ہوئی ہے۔ لہذا یہ مسئلہ اسی وقت حل ہو سکتا ہے جب ہم اسے عصمت کے ان معنی میں لے لیں جس کا ادعاء شیعہ چہاردہ معصومین کے بارے میں کرتے ہیں۔ اس حقیقت کی تائید محی الدین عربی جیسے عارف حضرات بھی کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ لفظ "رجس" لغت میں گندگی اور پلیدی پر اطلاق ہوتا ہے اور کیا گناہ سے بڑھ کر بھی کوئی گندگی ہو سکتی ہے؟ لہذا اہل بیت عصمت و طہارت سے برخوردار ہیں۔ ساتھ ہی وہ سلمان فارسی کی عصمت کو بھی ثابت کرتے ہیں۔(۱)

(۱) الفتوح المکیۃ جلد ا صفحہ ۱۹۶ نسخہ قدیم

وہ اپنی کتاب میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ اہل بیت کی برکتوں کے سبب کوئی بھی وہ خدا پرست دوزخ کی آگ میں نہیں جل سکے گا جس کے پاس رسول بھیجا گیا ہو۔

صحیح مسلم بھی احادیث کی ان کتابوں میں سے ہے جو تاکید کرتی ہے کہ اہل بیتؑ سے مراد صرف پنجتن پاک ہیں۔ یہ کتاب موثق اور صحیح حدیثوں کو اسناد کے ساتھ ضبط کرتی ہے۔ ان اسناد کا سلسلہ جلیل القدر صحابی جناب زید ابن ارقم سے جا ملتا ہے۔ ان روایتوں کے مطابق جب حضرت زید سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا ازواج بھی اہل بیت میں شامل ہیں تو وہ قسم کھا کر اس بات کی تردید کردیتے ہیں اور سبب یوں بیان کرتے ہیں:

"عورت زمانہ کے خاص حصہ میں مرد کے ساتھ ہوتی ہے اور اگر طلاق دیدی جائے تو وہ اپنے گھر ہی سدھار جاتی ہے جبکہ اہل بیت گھر کی اصل و اساس ہوتے ہیں"۔

آیہ تطہیر کے علاوہ مندرجہ ذیل آیہ شریفہ بھی اہل بیت کی عصمت پر دلیل ہے:

"اے ایمان والو خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ کی اطاعت کرو اور ان کی جو تم میں صاحبان امر ہیں۔ اگر کبھی کسی چیز میں اختلاف پیش آجائے تو اگر کہ تم خدا اور روز جزاء پر ایمان رکھتے ہو تو اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا تمہارے حق میں سب سے بہتر ہے"۔

امام فخر رازیؒ نے اس آیہ شریفہ کی تفسیر کے ذیل میں "اولی الامر" کی عصمت کو ثابت کیا ہے۔

وہ رقم کرتے ہیں (۱) کہ اللہ تعالیٰ نے "اولی الامر" کی پیروی کا حکم بہت حتمی اور ٹھوس انداز میں دیا ہے اور جس کی اطاعت کا حکم اس صراحت کے ساتھ صادر ہو'

(۱) تفسیر فخر رازی جلد ۱۰ صفحہ ۱۴۴

اس کا معصوم ہونا لازمی ہے۔ اس لئے کہ اگر لغزشوں سے اس کا دامن پاک نہ ہو تو اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ نعوذ باللہ خدا برائیوں کا حکم دیتا ہے۔ جبکہ ثابت شدہ بات ہے کہ خدا برائیوں سے روکتا ہے اور یہ اس پاک و منزہ ذات کے لئے ناممکن ہے کہ وہ ایک وقت میں کسی چیز کا حکم بھی دے اور اسی سے منع بھی کرے۔ (اجتماع امر و نہی) لہٰذا ثابت ہوتا ہے کہ "اولی الامر" معصوم ہیں۔(۱)

مکتب جعفری اس حد تک تو امام رازی سے متفق ہے کہ اولی الامر معصوم ہیں مخصوصاً" اس لئے بھی کہ ان کی اطاعت کو خدا اور رسول کی اطاعت کے نزدیک کہا گیا ہے اور اگر خاکم بدہن یہ لوگ معصوم نہ ہوتے تو ایک غیر معقول بات ہوتی کہ بارگاہ ربوبی سے بلا قید و شرط ان کی پیروی کا فرمان صادر ہوتا ـــــ لیکن ان کا یہ ادعاء کرنا کہ "اولی الامر" سے مراد "اصحاب اجماع" ہیں' ہماری نظر میں سراسر حقیقت کے خلاف ہے۔

اگرچہ وہ اس ادعاء کے ضمن میں کچھ دلائل بھی پیش کرتے ہیں۔ (۲) لیکن ہم یہی جواب دیں گے کہ آیہ شریفہ سے استفادہ کیا جاتا ہے کہ "اولی الامر" علم و دین کی ان بلندیوں پر فائز ہیں کہ ان کے بارے میں گناہ کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ مخصوصاً" اس وقت جب خدا نے ان کی اطاعت کو اپنی اور اشرف المرسلین صلی اللہ علیہ و آلہ کی اطاعت سے منسلک کرلیا ہو لیکن امت کے اجماع کرنے والوں کا تو دور دور تک بھی یہاں کوئی نشان نہیں ملتا اور شاید اگر پوری امت کو بھی اس اجماع میں جمع کرلیا جائے تب بھی یہ بات نہ آئے جبکہ خود اہلسنت کہتے ہیں کہ پانچ یا چھ افراد میں بھی اجماع امکان پذیر ہے۔ لہٰذا صاف نظر آتا ہے کہ جو لوگ اجماع کو ناقابل خدشہ سمجھتے ہیں وہ دراصل حضرت ابوبکر کی خلافت کو صحیح دکھانا چاہتے ہیں حالانکہ

---

(۱) تفسیر فخر رازی جلد ۱۰ صفحہ ۱۴۴

(۲) فخر رازی کے دلائل و اعتراضات اور ان کے دیئے گئے جوابات تفصیل سے کتاب میں نقل کئے گئے ہیں۔

ابتداء میں بڑے بڑے صحابہ کرام اس خلافت کے حق میں نہ تھے۔ انہی لوگوں میں جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ کے وہ حقیقی وارث بھی تھے جن کے بارے میں شیعہ و سنی حضرات نے پورے وثوق کے ساتھ نقل کیا ہے کہ:

آنحضرت صلی اللہ وآلہ نے فرمایا۔

"علیؑ حق کے ساتھ ہیں اور حق علیؑ کے ہمراہ جہاں جہاں یہ جائیں گے حق انکے پیچھے آتا جائے گا"۔

یہ وہی علیؑ ہیں جنہیں حدیث الثقلین میں خدا کی کتاب کا نظیر کہا ان معنی میں کہ گمراہی کا ان میں وہم و شائبہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ایک اور حدیث میں علیؑ کو سفینہ نوح سے تشبیہ دی اور فرمایا کہ علیؑ کے شیعوں کے علاوہ کوئی بھی خداوند عالم کے غضب سے نہیں بچ سکے گا۔

مزید یہ کہ جن معنی میں یہ لوگ اجماع کے قائل ہیں اس میں شریک لوگوں نے تو اتنی غلطیاں اور حماقتیں کیں ہیں کہ جن سے تاریخ اسلام روسیاہ ہوچکی ہے۔ اور مسلمان آج تک انکا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ امام رازی ان تمام چیزوں سے بخوبی واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ "اولی الامر" جن کی اطاعت کیلئے کہا گیا ہے وہی اہل بیت ہیں جن سے ہر قسم کی خطاء اور برائی کو دور رکھا گیا۔ اور جنہیں حدیث ثقلین اور بے شمار روایتوں میں مورد نظر ٹھہرایا گیا ہے۔ اور انکی فضیلت اور پاکیزگی کو ثابت کردیا گیا ہے لیکن جان لینا ایک بات ہے اور حق کیلئے ٹکر لینا اور آباء واجداد کے ورثہ کے خلاف آواز اٹھانا دوسری بات ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ اگرچہ آیہ شریفہ میں یہ صراحت نہیں ملتی کہ "اولی الامر" کون ہیں لیکن یہ بھی ثابت نہیں ہوتا کہ اس سے مراد اصحاب اجماع ہیں

بلکہ اس موقعہ پر قرآن وحدیث کی روشنی میں اس بات کا جائزہ لینا پڑے گا کہ یہ کون لوگ ہیں کہ جن کی اطاعت کو خدا کی اطاعت سے پیوستہ کردیا گیا ہے۔

اس مسئلہ کے حل کیلئے مکتب جعفری کے پاس دلائل و براھین کا ایک ایسا مجموعہ ہے جن میں کچھ صراحت کے ساتھ اور کچھ وضاحت کے ساتھ اس حقیقت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان میں جہاں آیہ تطہیر ہے وہاں حدیث ثقلین بھی ہے اسی طرح وہ حدیث بھی جس میں اہل بیت کو سفینہ نوح سے تشبیہ دی گئی ہے اور وہ بھی جس میں کہا گیا ہے کہ یہ زمین میں بسنے والوں کے لئے امان ہیں جس طرح سے ستارے آسمان والوں کے لئے امان ہوتے ہیں۔

ان تمام احادیث کا ماحصل یہی ہے کہ جس نے ان کی پیروی کی اور ان کا دامن تھاما وہ نجات پاگیا۔

ان کے علاوہ ان احادیث کو مدنظر رکھ کر جن میں بتایا گیا ہے کہ تمام بارہ امام قریش سے ہوں گے اور ان کے اسماء گرامی یہ ہیں ہم پورے اطمینان سے کہہ سکتے ہیں کہ "اولی الامر" یا عترت و اہل بیت وہی پاکیزہ ہستیاں ہیں جن کا سلسلہ جناب سیدہ سے شروع ہوا اور جن کی نشاندہی مختلف اور متعدد موقعوں پر رسول گرامی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ کرتے رہے۔

امام رازی کی طرح جب اہلسنّت کی ایک جماعت ان متواتر احادیث میں خدشہ کرنے سے عاجز ہوگئی تو انہوں نے مفاہیم و مضامین پر اعتراضات کی بوچھاڑ کردی۔اور کہا کہ یہ روایتیں نہ ظاہری لحاظ سے اور نہ صراحت کیساتھ ان لوگوں کی امامت کا اعلان کرتی ہیں۔

انہی افراد میں شیخ محمد ابو زہرہ بھی ہیں وہ اپنی کتاب میں حدیث ثقلین کو من و

عن صحیح ماننے کے بعد رقم کرتے ہیں کہ "لفظ عترت سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ مراد صرف فاطمیوں کے بارہ امام ہیں۔ اور یہ بھی سمجھ نہیں آتا کہ امامت وراثت کا جزو ہے یا سیاست کے ماتحت۔" (۱)

اگرچہ یہ بات صحیح ہے کہ حدیث میں لفظ عترت کے متعلق توضیح نہیں دی گئی لیکن اگر ان تمام قرینوں اور مناسبتوں کو بھی مدنظر رکھا جائے جن میں یہ حدیث بیان کی گئی ہے تو شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ عترت سے مراد وہی اہل بیت ہیں جنہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تحت الکساء کیا اور آیہ تطہیر کی تلاوت فرمائی۔ پھر یہ تمام احادیث انہی لوگوں کے شایان شان ہیں جو علم و دینداری کی معراج پر ہوں۔

خود صحابہ کرام بھی بخوبی جانتے تھے کہ عترت و اہل بیت کون ہیں۔ انہوں نے نہ جانے کتنی مرتبہ سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جناب سیدہ اور حضرت امیر کے دروازے پر اہل بیت پکارتے اور آیہ تطہیر کی تلاوت کرتے دیکھا تھا۔

نیز میدان مباہلہ میں خود یہ لوگ بتاتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی عترت کو نصاریٰ سے مقابلہ کرنے لے کر نکلے تھے۔ اور ان کے بارے میں فرمایا تھا۔

"اے خدا یہ میرے اہل ہیں" (۲)

آیہ تطہیر کے ضمن میں نقل کی گئی احادیث کی طرح حدیث ثقلین بھی حضرت زید ابن ارقم، جابر ابن عبداللہ انصاری، ابو سعید خدری، حضرت عائشہ، حضرت ابو ذر غفاری اور حذیفہ ابن اسید جیسے معتبر و محترم صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے نقل کی گئی ہے۔

---

(۱) امام صادق شیخ ابو زہرہ صفحہ ۱۹۹

(۲) صحیح مسلم جلد ۷ صفحہ ۱۳۱، مستدرک حاکم اور اہلسنت کی معتبر کتابیں

بعض صحابہ نے حدیث ثقلین (۱) کو تھوڑے سے اختلاف کیساتھ نقل کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب حبیب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حجتہ الوداع (آخری حج) سے مدینہ کی طرف پلٹ رہے تھے تو "جحفہ" کے مقام پر قیام کیا' منبر تیار کروایا اور پھر حمد و ثناء الٰہی کے بعد یہ ارشاد فرمایا۔

"اے لوگو! وہ وقت دور نہیں جب میرا بلاوا آ جائے اور میں لبیک کہوں۔۔! کیا تم لوگ خدا کی وحدانیت' محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بندے و رسول ہونے اور روز جزاء کی حقیقت پر گواہی دیتے ہو۔؟

لوگوں نے جواب دیا کیوں نہیں خدا کے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ سن کر اپنا ہاتھ اٹھایا اور سینہ پر رکھ کر کہا میں بھی گواہی دیتا ہوں لہٰذا دقت کرو کہ ثقلین میں کس طرح سے میری پیروی کرتے ہو۔

کسی نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ ثقلین کیا ہیں۔ فرمایا خدا کی کتاب اور میری عترت و میرے اہل بیت۔ خدائے دانا نے مجھے خبر دی ہے کہ یہ ہمیشہ ساتھ ساتھ رہیں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر مجھ سے آملیں گے۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امیر المومنینؑ کا ہاتھ پکڑا اور من کنت مولاہ کی حدیث کہی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حدیث ثقلین ظاہری لحاظ سے مختلف اور متفاوت انداز میں ہم تک پہنچی ہے لیکن اس کے معنی و مفہوم ایک ہیں۔ خود ظاہری فرق جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی ہو سکتا ہے جنہوں نے مختلف موقعوں اور مختلف مناسبتوں میں اسے مختلف انداز سے بیان کیا۔ لہٰذا معنی کے لحاظ سے یہ

---

(۱) حدیث ثقلین پہلے بیان کی جا چکی ہے۔

حدیث "متواتر" اور یقینی ہے۔ "مسعودی" فیض قدیر میں رقم کرتے ہیں کہ بیس سے زیادہ اصحاب بادفا نے اسے روایت کیا۔ ابن حجر بھی اس بات کی تائید کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اہلسنت کی جن معتبر کتابوں میں یہ حدیث رقم کی گئی ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

صحیح مسلم (مختلف اسناد کیساتھ)

ترمذی و نسائی

مستدرک حاکم

مسند احمد

طبقات ابن سعد

حلیتہ الاولیاء

اسد الغابہ

کنزا لعمال

مجمع الزوائد (ہیثمی)

فیض القدیر (مناوی)

تاریخ الطبری (ابن جریر طبری)

مروج الذہب المسعودی

سیرت ابن ہشام

بدایہ ابن کثیر

اس کے علاوہ بھی بہت سے مورخین اور محدثین ہیں جنہوں نے پوری دقت اور صحت کے ساتھ اسے روایت کیا۔

"صواعق محرقہ ابن حجر" میں مرقوم ہے کہ "خدا کے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن و عترت کو ثقلین کہا اس لئے کہ "ثقل" ہر نفیس' عالی منزلت اور پاک و پاکیزہ چیز کو کہتے ہیں اور کتاب خدا اور عترت طاہرہ ہو بہو ایسے ہیں اس لئے کہ دونوں دینی علوم' شرعی احکام اور اسرار و حکمت کا گہوارہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ختم نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انکی پیروی کرنے' ان سے پیوستہ رہنے اور ان سے علم حاصل کرنے پر زور دیا ہے۔ اور حمد و ثناء ہو اس پروردگار عالم کی کہ جس نے اہل بیت کی بدولت ہمارے لئے حکمت و دانش کا دروازہ کھولا"۔

وہ مزید لکھتے ہیں کہ احادیث تمسک سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ قرآن مجید پر عمل کرنے والے صدا اس کے ساتھ رہیں گے۔ اسی طرح اہل بیت کا دامن تھامنے والے بھی کبھی ان سے جدا نہ ہوں گے۔

ہم نتیجہ گیری کرتے ہیں کہ تعصب اور دشمنی کے باوجود ان میں سے کسی ایک شخص نے بھی اس حقیقت کا انکار نہیں کیا کہ اہل بیت ثقلین میں سے ایک ثقل ہیں اور ان سے تمسک کرنے والا ہرگز گمراہ نہ ہوگا۔

"مستدرک الصحیحین" کی پہلی جلد میں حبش الکنانی سے روایت ہوتی ہے کہ جس میں وہ بتاتے ہیں کہ میں نے خود حضرت ابو ذر غفاری کو اس حال میں دیکھا جب وہ خانہ کعبہ کا دروازہ تھامے ہوئے یہ کہہ رہے تھے۔

"اے لوگو! جس نے مجھے پہچان لیا سو پہچان لیا اور جس نے نہیں پہچانا وہ جان لے کہ میں ابو ذر ہوں اور میں نے بہ نفس نفیس سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے کہ'

"میرے اہل بیت کی مثال سفینہ نوح کی ہے کہ جو اس میں سوار ہو گیا نجات پا گیا

اور جس نے نجات کی کوئی اور راہ ڈھونڈھی وہ طوفان کی نذر ہو گیا۔"

اس حدیث میں تشبیہ کرنے کا واحد مقصد یہ بتانا ہے کہ ہلاکت اور گمراہی کی موجوں سے بچنے کی پہلی اور آخری چٹان اہل بیت علیہم السلام ہیں۔

اس حدیث کو انہی الفاظ یا اس سے ملتے جلتے انداز میں کنز العمال' مرقات' حلیہ' ذخائر' تاریخ بغدادی' درمنثور' کنوزالحقائق (مناوی) مجمع الزوائد' صواعق ابن حجر نے ضبط کیا ہے اور بزاز اور طبرانی کے علاوہ دوسرے راویوں نے اتنی کثرت سے اسے صحابہ کرام سے روایت کیا ہے کہ ہم ان کی تعداد و شمار سے قاصر ہیں۔

ان روایتوں کے سلسلے حضرت ابو ذر غفاری' ابن عباس' انس ابن مالک' ابو سعید خدری اور خود نفس رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یعنی امیر المومنین تک جا پہنچتے ہیں۔

ان تمام روایتوں سے جنہیں اہل تشیع و تسنن کے حدیث کے مجموعہ پوری کثرت کے ساتھ رقم کرتے ہیں' یہ سمجھ میں آتا ہے کہ خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زندگی کے ہر میدان اور ہر موڑ پر اس بات کی تیاری کر رہے تھے کہ اس ذریہ طیبہ کو امت اسلامی کی قیادت سونپ دیں۔ اور انہی کی جانب مسلمانوں کی توجہ مبذول کرائیں تاکہ مسلمان دینی اور دنیاوی تمام مشکلات میں انہیں کی طرف رجوع کریں۔ اور کہیں ایسا نہ ہو کہ عالم اسلام کی قیادت کسی اور ہاتھوں میں چلی جائے اور رسالت کی راہ میں اٹھائی گئی تکلیفیں برباد ہو جائیں۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں کبھی سفینہ نوح سے تشبیہ دیتے ہیں اور کبھی مغفرت و بخشش کے باب سے توصیف کرتے ہیں۔ اور کبھی ان کیلئے آسمانی ستاروں کی مثال لاتے ہیں۔

اس چیز کا اشارہ بھی خود احادیث سے ملتا ہے کہ جناب خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم اس سے خائف تھے کہ کہیں ہوا و ہوس اور حسد و جلن پھر سے اس قوم پر حاکم نہ ہوجائے جو اس پاک و طاہر نسل کی کنارہ گیری اور ان کے شیعوں کی موت کا باعث بنے۔

سورہ شوریٰ کی آیات یہی بتانے کیلئے عالم وحی سے نیچے اتری تھیں کہ احمد مرسل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زحمتوں کا صلہ اور رسالت کی ادائیگی کا بدلہ یہی ہے کہ ان کے ان اہل بیت اور اقرباء سے محبت کی جائے اور جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ان کی حفاظت کی جائے۔

"قل لا اسئلکم علیہ اجرا" الاالمودۃ فی القربیٰ"

اے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان لوگوں سے کہہ دو کہ میں تم سے رسالت کا کوئی صلہ نہیں چاہتا سوائے اس کے کہ میرے اہل بیت و اقرباء سے محبت کی جائے۔

اہلسنّت کے مشہور و معروف مفسر زمخشری اپنی تفسیر کی کتاب "کشاف" میں اس آیہ شریفہ کے ضمن میں روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت دل میں لئے مرا' اس نے شہادت کی موت پائی' مغفرت و رحمت کی موت پائی اس حالت میں مرا کہ اس کا ایمان کامل ہوگا منکر نکیر اسے بہشت کی نوید دیں گے اور خدا وند کریم اس کیلئے بہشت سے متصل کھڑکیاں کھول دے گا۔ لیکن جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دشمنی لئے مرا وہ جنت کی خوشبو بھی نہ سونگھ پائے گا اور روز محشر اس کے ماتھے پر نقش ہوگا۔

"خدا کی رحمت سے مایوس"

فخررازی بھی اس آیہ شریفہ کے ضمن میں یہ حدیث نقل کرتے ہیں اور پھر رقم کرتے ہیں کہ آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ لوگ ہیں جن کے امور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف پلٹتے ہیں لہٰذا جس کا پیوند بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مضبوط ہوگا وہ آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

فیروز آبادی اس پر یہ اضافہ کرتے ہیں کہ چونکہ کسی شک و شبہ کے بغیر جناب سیدہ، حضرت علیؑ اور حسنین علیہما السلام کا رابطہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہت گہرا تھا لہٰذا یہی لوگ آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ اس بات کی شاہد تمام متواتر روایتیں ہیں۔

"مجمع الزوائد" "کنوز الحقائق" ذخائر عقبیٰ" اور نورالابصار (شبلنجی) میں کچھ روایتیں دکھائی دیتی ہیں جو موضوع کے حساب سے زمخشری کی روایت سے ملتی ہیں۔ (۱)

اگر بالفرض زمخشری کی روایت صحیح بھی ہو تو مراد یہ بتانا ہے کہ وہ محبین جو عملی میدان میں اہل بیت کی پیروی کرتے ہیں، یہ لوگ اعلیٰ درجوں پر فائز ہیں ورنہ صرف چاہنے والے عام لوگوں کی طرح ہیں اگر خداوند عالم انہیں معاف کر دے تو اس کی مغفرت ہے اور اگر عذاب دے تو اسکی عدالت ہے۔ پھر جس طرح سے یہ تعجب آمیز بات نہیں کہ اہل بیت کے حقیقی پیروکار معصومین علیہم السلام کے قول و فعل کو نمونہ عمل بنا کر عالی رتبہ حاصل کریں گے اسی طرح انکی تعلیمات جھٹلانے والوں کیلئے بھی کچھ عجب نہیں کہ کافر و منافق لوگوں کے ساتھ جہنم کی آگ میں جھلس رہے ہوں۔

*

---

(۱) صحاح ستہ میں باب فضائل الخمسہ جلد ۲ صفحہ ۷۹۔۷۸

بارہ امام قریش سے ہیں

گذشتہ احادیث نبویؐ سے ثابت ہو چلا ہے کہ اہل بیت اطہار علیہم السلام قرآن کی شبیہ اور قرآن کی نظیر ہیں۔ لہٰذا جو لوگ ان کا دامن تھامتے ہیں وہ قرآن مجید سے رشتہ جوڑتے ہیں اور جو ان سے منہ موڑتے ہیں وہ درحقیقت قرآن سے روگردانی کرتے ہیں۔

نیز جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ نے یہ بھی بتایا تھا کہ میرے اہل بیت سفینہ نوح ہیں، رحمت و مغفرت کا دروازہ ہیں اور زمین پر بسنے والوں کے لئے امن وامان کا پیام ہیں۔

یہ تمام احادیث مسلمانوں پر فرض کردیتی ہیں کہ وہ زندگی کے تمام شعبوں اور دنیا کی تمام مشکلات میں ان پاک ہستیوں کی طرف رجوع کریں لیکن اس ڈر سے کہ کہیں

حسد و رشک اور ہوا و ہوس کے بادل پھر سے نہ چھاجائیں محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ نے ان ہادیوں کی تعداد بتائی۔ اس بات کا اعتراف اہلسنّت بھی کرتے ہیں جبکہ شیعہ حضرات یہ بھی ادعاء کرتے ہیں کہ سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ نے تعداد کے ساتھ ساتھ ان کے اسماء گرامی کی نشاندہی بھی کردی تھی تاکہ توجیہ و تاویل کے رخنہ نہ ڈالے جائیں اور حجت تمام کی جائے۔

البتہ اہلسنّت حضرات ان تمام احادیث کو جن میں صرف تعداد کی نشاندہی کی گئی ہے ایک خاص انداز سے دیکھتے ہیں اور اپنے عقیدے کی مطابقت میں اس کی تفسیر کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں صحیح بخاری میں جابر ابن سمرہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا۔

"امام بارہ ہوں گے"۔ (۱)

اس کے جملہ کے بعد بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ نے کچھ ارشاد فرمایا تھا۔ لیکن بقول راوی کے وہ سن نہیں سکے۔ ان کے والد نے انہیں بتایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ فرمارہے تھے۔

"سب کے سب قریش سے ہوں گے"۔

یہی حدیث دو مختلف سندوں کے ساتھ مسند امام احمد کی پانچویں جلد میں ملتی ہے۔

اس قسم کی مزید دو حدیثیں صحیح بخاری میں بھی رقم کی گئی ہیں جن میں حضرت خاتم الانبیاء ارشاد فرماتے ہیں۔

"یہ دین قیامت تک باقی رہے گا اور اس میں بارہ خلیفہ آئیں گے۔ یہ سب قریش سے ہوں گے۔"

---

(۱) صحیح بخاری۔ کتاب الاحکام (یکون اثنی عشر امیرا")

صحیح ترمذی، صواعق ابن حجر اور مستدرک حاکم اسی مضمون کو اس اضافہ کے ساتھ رقم کرتے ہیں کہ ان خلفاء کی تعداد بنی اسرائیل کے پیشواؤں کے برابر ہوگی۔

"مجمع الزوائد" اور "کنزا لعمال" میں بھی یہی روایتیں ملتی ہیں البتہ کنزا لعمال میں یہ بھی مرقوم ہے کہ ابن عدی اور ابن عساکر نے اسے ابن مسعود سے روایت کیا ہے۔

ان دو کتابوں کے علاوہ مناوی "فیض القدیر" میں اسے نقل کرتے ہیں اور دوسرے مصنف اور محدث حضرات بھی اسے روایت کرتے ہیں۔

حلیتہ الاولیاء (۱) میں ابو نعیم حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے ایک روایت نقل کرتے ہیں جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ فرماتے ہیں۔

"اگر کوئی میری طرح جینا، میری طرح مرنا اور پھر بعد کی زندگی میرے ساتھ بہشت میں گزارنا چاہے تو وہ علیؑ کو میرے بعد اپنا مولیٰ و حاکم بنالے۔ اور ان کے بعد ان آئمہ علیہم السلام کی پیروی کرے جو میری عترت ہیں اور میری مٹی و طینت سے وجود میں آئے ہیں۔ یہ لوگ علم و فہم کی وادیوں میں پروان چڑھے ہیں لہٰذا جو انہیں جھٹلائے گا وہ میری شفاعت سے محروم رہے گا۔

تمام اختلافات کے باوجود یہ حدیث ثابت کردیتی ہے کہ امامت کے مستحق افراد صرف بارہ تھے بالکل انہی پیشواؤں کی طرح جنہیں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی ہدایت اور اصلاح کے لئے مبعوث کیا تھا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے۔

"اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے وعدہ لیا اور ان میں بارہ پیشواؤں کو مبعوث کیا۔"

اس تعداد کے بارے میں کسی کو کوئی اعتراض نہیں۔ اس کے علاوہ ابو نعیم کی

---

(۱) حلیتہ الاولیاء جلد اول صفحہ ۸۶

روایت کے مطابق یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کی عترت اور ان کے خاندان سے ہوں گے جبکہ صحیح مسلم کی روایت تصریح کرتی ہے کہ یہ لوگ نہ صرف اسلام کی بقاء تک بلکہ رہتی دنیا تک باقی رہیں گے۔

"باقی رہنے" کا جو تصور اس حدیث میں پیش کیا گیا ہے اس سے ضروری نہیں کہ یہی مراد لی جائے کہ یہ سب لوگ ایک وقت میں باقی رہیں گے یا ان کے جسم باقی رہیں گے بلکہ اگر ایک خاص مدت تک یہ لوگ ایک ایک کرکے آتے جائیں اور پھر ان کی تعلیمات و طرز زندگی باقی رہ جائے تو بقاء کا مفہوم پورا ہوجاتا ہے۔

اگر ہم کچھ دیر کے لئے بھول جائیں کہ شیعہ ان احادیث کے بارے میں کیا کہتے ہیں تو ہمیں اس بارے میں کوئی بھی قابل اطمینان توضیح نہیں ملتی۔ اس لئے کہ خلافت اور پھر ملوکیت کا جو سلسلہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ کے بعد شروع ہوا اس کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ نے بتائی تھی۔ لہٰذا یہ لوگ توجیہ و تاویل کے دفتر کھولتے ہیں اور مخالف ومتضاد باتیں کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک مقولہ تو یہ ہے کہ جن بارہ اماموں کا تذکرہ احادیث میں ملتا ہے اس کے آخری فرد ہشام ابن عبدالملک ہیں جبکہ ابن کثیر اس بارے میں لکھتا ہے کہ اگر عبداللہ ابن زبیر کو شامل کرلیا جائے تو یہ تعداد سولہ تک پہنچ جائے گی۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ان بارہ خلفاء کے آخری شخص سلیمان ابن عبدالملک ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ یزید ابن معاویہ اور مروان ابن حکم جیسے بدبخت لوگ بھی اس زمرے میں آجاتے ہیں۔ جن سے دین کی بقاء وابستہ رہتی ہے اور جو رہتی دنیا تک باقی رہیں گے۔

کچھ لوگ یوں توجیہ کرتے ہیں کہ مذکورہ بالا افراد سے مراد حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ

وعثمانؓ اور بنی امیہ کے وہ نو عدد خلفاء ہیں جن کے بارے میں امت اسلامی اختلاف رائے کا شکار نہیں ہوئی۔ اس طرح جناب امیر علیہ السلام اور امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام اس ضمن میں نہیں آتے کیونکہ ان دونوں کی شخصیتیں مسلمانوں کے نزدیک متنازع تھیں۔ جبکہ خود ابن کثیر کی تاریخ میں بیہقی سے روایت ہوتی ہے کہ یہ لوگ اہل حق ہونے کے ساتھ ساتھ اہل بہشت بھی ہوں گے۔

ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ چونکہ اس قسم کی احادیث میں یہ وضاحت ملتی ہے کہ یہ خلفاء اسلام کا عملی نمونہ ہوں گے لہٰذا وہی مخصوص خلیفہ ہونے چاہئیں جو پہلی صدی میں گزرے تھے۔ اس لحاظ سے خلفاء راشدہ کے علاوہ امام حسنؑ و حسینؑ علیہما السلام اور عمر ابن عبدالعزیز جیسے نیک لوگوں کو اس میں ہونا چاہئے۔

امام سیوطی ان لوگوں میں عبداللہ ابن زبیر، مہدی عباسی، ملک الظاہر اور معاویہ بن سفیان کا اضافہ کرتے ہیں۔ وہ ساتھ ساتھ معترف ہیں کہ یہ لوگ اس معیار پر پورے نہیں اترتے جو حدیث میں بتایا گیا ہے۔ تعداد پوری کرنے کے لئے انہیں مزید دو خلفاء کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایک کو وہ حضرت مہدی موعود بتاتے ہیں اور دوسرے کا ذکر نہیں کرتے۔

یہ ایسا سفید جھوٹ اور ایسے مغالطات ہیں کہ جن سے صاف ظاہر ہے کہ اہلسنّت جب ان احادیث کی سند میں خدشہ کرنے سے عاجز آگئے تو انہوں نے توجیہ و تفسیر کا یہ انداز اپنایا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اہلسنّت کی طرف سے کی گئی تفسیریں عدل و منطق کی رو سے ان احادیث سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں جبکہ مکتب تشیع کی طرف سے کئے گئے معنی لفظ بہ لفظ اور من و عن اس پر پورے اترتے ہیں۔

خود صحیح مسلم کی روایت میں یہ اشارہ ملتا ہے کہ اسلام کا مستقبل ان کے وجود سے وابستہ ہے۔ جبکہ اگر ہم ان خلافتوں کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ خلفاء راشدین میں کچھ حضرات اور حضرت عمر ابن عبدالعزیز کے علاوہ تمام خلفاء نے ہدایت کرنے سے زیادہ لوگوں کو گمراہ کیا ہے اور عام سلاطین کی طرح فساد اور لوٹ مار کا بازار گرم کیا ہے۔

ایسی صورت میں کیونکر ممکن ہے کہ سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ ایک ہی اخلاق وخو کے ان خلفاء نما سلاطین میں سے صرف بارہ افراد کو اس امتیاز سے نوازیں۔

لہٰذا اگر کسی کو حقیقت تک پہنچنا ہے اور فخر انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ کے سنہری کلمات کو بلاجواز ہونے سے بچانا ہے تو اسے ماننا پڑے گا کہ بارہ اماموں سے مراد ان کے اقرباء اور ان کی عترت میں ہیں جو ایک ایک کرکے اس منصب پر فائز ہوں گے اور ان میں بارہویں امام حضرت مہدی عج اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف (خدا ان کے ظہور کو نزدیک کرے) زندہ رہیں گے۔ تاکہ ظلم وستم سے بھری ہوئی دنیا میں عدل و انصاف کا پرچم لہرا دیں اور بشریت کو اپنے جدا امجد صلی اللہ علیہ وآلہ کی سیرت پر چلائیں۔

اس کے علاوہ استاد توفیق ابو علم نے اپنی کتاب اہل بیت میں اماموں کے لئے کچھ شرائط کو لازمی قرار دیا ہے۔ ابن خلدون جیسے مشہور مورخ اور ماوردی جیسے دانشمند بھی ان شرائط کا تذکرہ کرتے ہیں۔ کتاب وسنت کا علم، عصمت، عدالت، شجاعت اور حسب ونسب انہی بنیادی شرائط میں سے ہیں۔

استاد توفیق ابو علم لکھتے ہیں کہ شیعہ اپنے اماموں کی عصمت کے قائل ہیں جسے وہ

حدیث ثقلین کے ذریعہ ثابت کرتے ہیں۔ ان معنی میں کہ جس طرح سے خدا کی کتاب ہر غلطی سے پاک ہے اسی طرح اہل بیت کا دامن بھی ہر لغزش سے مبرّیٰ ہے۔ ورنہ ان دونوں میں موازنہ کرنا اور ایک کو دوسرے کا نظیر کہنا صحیح نہ ہوتا۔

استاد توفیق ان چیزوں کو رقم کرنے کے بعد اس محفل کا حوالہ بھی دیتے ہیں جس میں آٹھویں امام حضرت علی ابن موسیٰ رضی علیہ السلام مامون کے دربار میں دوسرے مکاتب کے علماء پر اپنی حقانیت ثابت کررہے ہیں۔

امام علیہ السلام فرماتے ہیں کہ باری تعالیٰ نے قرآن مجید میں بارہ جگہ اہل بیت رسولؐ اور عترت طاہرہ کی تفسیر کی ہے۔ لہٰذا اس ضمن میں آپ آیہ انذار (وانذر عشیر تک الاقربین' آیہ تطہیر' آیہ مودت اور آیہ مباہلہ کا تذکرہ کرتے ہیں۔)

آیہ مباہلہ اس وقت اتری تھی جب نصرانیوں کا اہم ترین وفد پیغمبر اسلامؐ سے ملنے آیا تھا اور جب ایک طویل بحث و مباحثہ کے بعد بھی انہوں نے آپ کی بات ماننے سے انکار کردیا تو خداوند عالم نے آپ کو یہ حکم دیا۔

"پس اگر کوئی جان لینے کے بعد بھی تم سے حجت کرے تو ان سے کہہ دو کہ ہم اپنے بچوں اپنی عورتوں اور اپنے نفسوں کو لے آئیں گے۔ تم بھی اپنے بچوں' عورتوں اور نفسوں کو لے آؤ پھر مباہلہ کریں گے اور جھوٹے پر خدا کی لعنت قرار دیں گے"۔

سیرت النبیؐ کے تمام مصنفین لکھتے ہیں کہ اس آیہ شریفہ کے اترتے ہی جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ نے امام حسن و حسین اور امیرالمومنین علیہ السلام اور جناب سیدہ کو ساتھ لیا اور نصرانیوں سے مقابلہ کے لئے تشریف لے گئے۔

زیادہ تر محدث حضرات بھی کہتے ہیں کہ آیہ شریفہ میں "ابناء نا" سے مراد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ کے بچے یعنی امام حسن اور امام حسین ہیں۔ "نساء نا" کے

معنی جناب سیدہ پر پورے اترتے ہیں۔ اور "انفسنا" کے مصداق حضرت علیؑ ہیں۔

امام علی ابن موسیٰ رضاؑ نے آیہ مباہلہ کے بعد اس آیہ شریفہ کی تلاوت فرمائی۔

وآت ذاالقربی حقّہ

اے رسول گھر والوں (قرابتداروں) کو ان کا حق دیدو۔

آٹھویں امام علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اس آیہ شریفہ کا نازل ہونا تھا کہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ اپنی بیٹی فاطمہؑ کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا۔

"یہ باغ فدک جو کسی جنگ وجدل کے بغیر حاصل کیا گیا تھا اور میری ذاتی ملکیت تھا' خدا کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اسے میں تمہارے حوالے کرتا ہوں۔ تم اسے اپنے اور اپنے بچوں کے لئے لے لو"۔

امام رضا علیہ السلام نے اس آیہ شریفہ کے بعد آیہ مودت کی تلاوت فرمائی۔

قل لا اسئلکم علیہ اجرا الا المودۃ فی القربی۔

"اے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ ان سے کہہ دو کہ میں رسالت کا کوئی صلہ نہیں چاہتا سوائے اس کے کہ میرے اہل بیت سے محبت کی جائے۔"

امام علیہ السلام فرماتے ہیں کہ یہ ایک ایسی محبت ہے جسے خداوند عالم نے تمام مسلمانوں پر فرض کیا ہے اور اگر کوئی شخص خلوص دل کے ساتھ محمدؐ و آل محمدؐ کو چاہے گا تو جنت اس کے لئے لازمی ہوجائے گی۔

آیہ مودت کے بعد نوبت اس آیت تک آپہنچی۔

ان اللہ و ملائکتہ یصلون علی النبی یاایھاالذین امنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما!

بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے ملائکہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علی وآلہ پر صلوۃ بھیجتے ہیں اے ایمان والو تم بھی ان پر سلام نچھاور کرو۔

کسی نے عرض کی یا رسول اللہ سلام تو ہم نے سیکھ لیا ہے لیکن درود بھیجنا نہیں آتا۔ آپ صلی اللہ علی وآلہ نے فرمایا اس طرح سے درود شریف بھیجا کرو۔

اللھم صلی علی محمد و ال محمد کما صلیت و بارکت علی ابراھیم وال ابراھیم انک حمیدا" مجید

اے خدا محمدؐ وآل محمدؐ پر درود بھیج اسی طرح سے جس طرح تو نے حضرت ابراہیم اور ان کی آل پر برکتیں نازل کیں اور درود بھیجے۔ پروردگارا تو بہت بزرگوار اور ستائش کرنے والا ہے۔

پھر امامت کے آٹھویں ستارے اس آیہ شریفہ کو پیش کرتے ہیں۔

فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لاتعلمون۔

اگر نہیں جانتے تو اہل ذکر سے پوچھو۔

توضیح دیتے ہوئے امام بتاتے ہیں کہ ہم اہل ذکر ہیں کیونکہ خود قرآن مجید نے سورہ طلاق میں جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ کو ذکر کی حیثیت سے یاد کیا ہے۔

فاتقوا اللہ یا اولی الالباب الذین امنوا قد انزلنا علیکم الذکر رسولا یتلو علیکم ایات بینات

"اے ایمان والو اور صاحبان فہم وفراست خداوند عالم کا تقویٰ اختیار کرو اس لئے کہ اس نے تمہارے لئے ایک ایسا رسول (ذکر) بھیجا جو تم پر واضح وروشن آیات کی تلاوت کرتا ہے"۔

امام غریب الغرباء نے اس سلسلہ سخن کو یہاں تک جاری رکھا کہ دربار میں موجود مامون اور دوسرے مذاہب کے علماء اور مفکر یہ کہہ اٹھے کہ'

"ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ ہی وہ اہل بیت ہیں جو ان تمام آیات میں مورد نظر

ہیں اور ان کے حقیقی مصداق ہیں۔ خداوند عالم آپ لوگوں کو جزائے خیر دے"۔

استاد توفیق ان فضائل کو بیان کرنے کے بعد نتیجہ گیری کرتے ہیں کہ امام حسن و حسین اور حضرت امیر علیہ السلام و جناب سیدہ اور ان کی پاک و پاکیزہ نسل ہی اصحاب کساء اور عترت طاہرہ ہیں۔

وہ اس ضمن میں کچھ اور احادیث بھی روایت کرتے ہیں جو اس کتاب کے دائرے سے خارج ہیں۔

ام المومنین حضرت خدیجہ بنت خویلد

اس سے پہلے کہ ہم جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ کی سب سے محبوب اور بے مثال اہلیہ کا تعارف کروائیں ان کے بارے میں ایک مشہور تاریخی شخصیت بنت الشاطی کے کچھ تاثرات رقم کرتے چلیں وہ فرماتی ہیں۔

"کیا جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ کی کسی اور زوجہ محترمہ کو یہ سعادت حاصل ہوئی کہ ان کٹھن مرحلوں میں غار حراء سے اٹھتی ہوئی اس خدائی دعوت کا استقبال کریں جس کھلے دل خلوص اور راسخ عقیدے کے ساتھ جناب خدیجہ نے اسے لبیک کہا۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کی رسالت اور ان کی کامیابی ونصرت پر ذرہ برابر شک نہ کیا۔ ورنہ کیسے ممکن ہے کہ ایک باوقار و باعزت خاندان سے ہونے اور ناز ونعمت میں زندگی بسر کرنے کے

باوجود وہ اس بڑھاپے میں تمام آسائشیں ترک کرکے خود کو آنحضرتؐ کی خدمت پر راضی کرلیں۔ اور اس سخت موڑ پر جب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وحی نازل ہونے کی وجہ سے روحی اور نفسانی دباؤ میں ہوں، انہیں سکون و اطمینان کا سانس دیں۔؟ اس دور میں انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ کو مسلسل ہمت دلائی اور ہمیشہ ان کے درد کی شریک رہیں"۔

حضرت خدیجہ نے ایک بڑے اور معزز خاندان میں آنکھیں کھولیں۔ آپ کی والدہ بھی شریف خاندان کی بیٹی تھیں اور والد بھی وجیہ ترین خاندانوں میں سے تھے۔ دونوں قریش سے تھے اور دونوں کے آباء واجداد کا سلسلہ جناب لوی ابن غالب پر جاکر ایک ہوجاتا ہے۔

خاندانی حسب ونسب کے ساتھ ساتھ حضرت خدیجہ ان خوبیوں کی مالک تھیں کہ مکہ کے لوگوں نے انہیں "طاہرہ" اور قریش کی عورتوں کا قائد اور پیشوا کہا۔

ماں باپ کے علاوہ تاریخ ان کے ایک چچازاد بھائی ورقہ ابن نوفل کا ذکر بھی کرتی ہے جو بت مت سے بیزار تھے اور آسمانی ادیان کی کتابوں کا مطالعہ کرکے مجموعاً" ان کی خوبیوں پر عمل کرتے تھے۔

سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ کے عقد میں آنے سے پہلے حضرت خدیجہ دو افراد سے شادی کرچکی تھیں۔

ان کے پہلے شوہر ابوہالہ تھے جن سے ہند نامی فرزند پیدا ہوا تھا۔ بعثت کے دور میں ہند پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ پر ایمان لایا۔ آپؐ کے باوفا اصحاب کی صف میں رہا اور آپؐ کے بعد امیرالمومنین علیہ السلام کے ساتھ رہا یہاں تک کہ بصرہ کی جنگ میں شہادت پائی۔

شادی کے کچھ سال بھی نہ گزرے تھے کہ ابو ہالہ مرحوم ہوگئے اور حضرت خدیجہ جناب ابو عاید مخزومی کی زوجیت میں آگئیں۔ خداوند عالم نے اس دوسرے شوہر سے آپ کو بیٹی دی۔ جس کا نام بھی ہند رکھا گیا۔ یہ صاحبزادی بھی ان لوگوں کی صف میں رہی جن کا ایمان سچا اور پائیدار ہوتا ہے۔

اتفاق سے کچھ سال بعد ابو عاید بھی چل بسے اور حضرت خدیجہ نے تن تنہا زندگی گزارنے کو ترجیح دی۔ لیکن چونکہ آپ اپنی جوانی کے دور میں تھیں اور صورت وسیرت میں بھی بے نظیر تھیں لہٰذا بڑے بڑے امراء اور روساء کے یہاں سے پیغام آتے تھے۔ البتہ یہ لوگ آپ سے زیادہ آپ کے مال و دولت کے شیدائی تھے۔ آپ سب کو ٹھکراتی رہیں یہاں تک کہ عمر چالیس برس کی ہوگئی۔

لیکن اسی دوران جب جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ کی صورت و سیرت دیکھی اور ان کی صداقت وامانت کے چرچے سنے تو آپ ان پر فریفتہ ہوگئیں۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ بنی ہاشم کا چشم و چراغ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی جوانی کے ابتدائی دن گزار رہے تھے۔ اس وقت ان کے چہرے کا نور تمام افراد کو اپنی جانب کھینچ لیتا تھا۔ جبکہ خود حضرت خدیجہ عمر میں ان سے بہت بڑی تھیں اس کے علاوہ وہ دو افراد کی بیوہ بھی بن چکی تھیں۔ لہٰذا ان کے لئے خواستگاری کرنا بہت دشوار تھا اور اسی وجہ سے وہ اکثر پریشان رہتیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ کو یاد کرتیں۔ لیکن بہت جلد ان کی بہن "ہالہ" نے اس مشکل کو پالیا اور ان کی طرف سے آنحضرتؐ سے تقاضائے ازدواج کیا۔(۱)

لہٰذا یہ جو مشہور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کے ساتھ شادی اس تجارتی قافلہ کا دور میں نتیجہ تھی، صحیح نہیں۔

---

(۱) تاریخ یعقوبی حضرت عمار بن یاسر سے روایت

بہرحال سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ سے آپ کا عقد حضرت ابو طالب اور دوسرے بزرگوں کی رضایت سے طے پایا اور آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ کی زوجیت میں آگئیں۔

شاید یہی سچی محبت تھی کہ عمر کے اس اختلاف کے باوجود آپ دونوں نے پچیس سال کی ازدواجی زندگی پیار ومحبت اور ذہنی ہم آہنگی کے ساتھ گزاردی اور جناب سیدہ جیسی صالح اولاد بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئی۔

اس زندگی کا نازک ترین مرحلہ وہ وقت تھا جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ رسالت پر مبعوث ہورہے تھے۔ یہ ایک نئے دور کا آغاز تھا جس میں آنحضرتؐ کا واسطہ عالم وحی سے تھا۔ اور اس کے باوجود کہ انہوں نے اپنے کو اس مہم کے لئے تیار کرلیا تھا لیکن اس نئے مرحلہ نے انہیں ہراساں کردیا تھا۔ رات گزارنے کے بعد سپیدہ صبح میں وہ اپنی اس دکھ درد کی ساتھی کے پاس آکر تسکین کا احساس کرتے اور انہیں انتہائی شفیق پاتے۔ وہ آپؐ کو اپنے پہلو میں بٹھاتیں' آپؐ کے لئے فرش بچھاتیں اور آرام کی نیند سلادیا کرتیں۔ سونے سے پہلے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ غار میں پیش آنے والے واقعات سے انہیں آگاہ کردیتے لیکن ہر دفعہ وہ آپؐ کو دلاسا دیتیں اور روشن مستقبل کی نوید سناتیں۔

آپؐ کو سلا کر وہ اپنے چچازاد بھائی کے پاس جاتیں اور غار حرا کی روداد بیان کرتیں۔ ورقہ ابن نوفل چونکہ آسمانی ادیان کی کافی بصیرت رکھتے تھے لہٰذا انہیں آنحضرتؐ کے نبی ہونے کی بشارت دیتے یہاں تک کہ باقاعدہ طور پر قرآنی آیات کا نزول عمل میں آیا اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ کی رسالت ثابت ہوگئی۔

ہوا کچھ اسطرح سے کہ ایک دن جب حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ جناب خدیجہ

کے پاس تشریف فرما تھے تو آسمان سے وحی اتری۔ آپؐ نے اپنی اس باوفا صحابی کو اٹھایا اور فرمانے لگے۔

"اے خدیجہ اٹھئے اب آرام و آسائش کے دن گئے۔ جبریل امین میرے سامنے کھڑے ہیں اور خدا کا پیغام لائے ہیں کہ میں لوگوں کو فقط خدائے احد کی بندگی کا پیام دوں اور عذاب اخروی سے ڈراؤں"۔

یہی دن تھا جب توحید کی آواز خانہ کعبہ میں گونجی اور لات ومنات لرزنے لگے۔ اسی بت پرستی کی مخالفت کرنے پر سرزمین عرب آپ کی دشمن ہوگئی۔ لیکن حضرت خدیجہ جو آپ پر ایمان کا اظہار کرچکیں تھیں۔ یہاں بھی آپ کے ساتھ تھیں۔ پھر جب قریش نے بنی ہاشم سے قطع تعلق کرلیا اور انہیں ایک تنگ اور بے آب وگیاہ گھاٹی میں محصور کردیا تو حضرت خدیجہ بھی ان سب کے ساتھ نظربند رہیں۔ یہاں اکثر اوقات بھوک اور فاقہ کی شدت سے عورتوں اور بچوں کی چیخیں بلند رہتیں اور حضرت خدیجہ ایک بڑی رقم صرف کرکے اور چھپا کر ان کے لئے کھانے کا سامان فراہم کرتیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ یہ آپ کی اور حضرت ابو طالب کی زحمتوں کا نتیجہ تھا کہ توحید کی آواز ہر گھر سے سنائی دینے لگی اور شاید اسی خلوص کی بناء پر جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ نے ان دونوں کی وفات کے سال کو غم و اندوہ کا سال (عام الحزن) قرار دیا۔ آپ دونوں کی عدم موجودگی میں گویا وہ اپنے آپؐ کو تن تنہا محسوس کرنے لگے تھے جسے دیکھ کر قریش اس خوش فہمی میں مبتلا ہوگئے تھے کہ یہ احساس آنحضرتؐ کو کامیابی تک نہ پہنچنے دے گا لیکن اللہ تعالیٰ نے ہجرت کا سفر فراہم کرکے انہیں ایسے

بادفا انصار عطا کئے جنہوں نے پورے جزیرہ عرب میں اسلام کا پرچم لہرادیا۔

بہرحال امہات المومنین میں صرف حضرت خدیجہ کو یہ مرتبہ حاصل ہے کہ ان کی جدائی کے بعد آنحضرتؐ انہیں شدت سے یاد کریں۔

آپؐ اکثر اوقات حضرت خدیجہ کی خوبیوں کے قصیدے پڑھتے رہتے اور کبھی ان کی بہن کی آواز سنتے تو خیال کرتے کہ یہ وہی محبت بھری خدیجہ کی آواز ہے۔ اگرچہ مختلف وجوہ کی بناء پر سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ نے کئی عقد کرلئے تھے لیکن ان کے اس احساس کی تسکین پھر بھی نہ ہوسکی تھی۔ اس لئے کہ ان میں سے کچھ ازواج تو خود ستم دیدہ اور زمانے کی ماری تھیں۔ اور باقی آپؐ کی خدمت کرنے کے بجائے آپؐ کو پریشان کرنے کے درپے رہتیں اور بات بات پر جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ کو طعنہ دیتیں۔

جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ جب بھی حضرت خدیجہ کو یاد کرتے تو حضرت عائشہ سے برداشت نہ ہوتی اور کہتیں۔

"آپؐ ہمیشہ قریش کی بڑھیاؤں میں سے ایک بڑھیا کو غم و حسرت سے یاد کرتے ہیں اور اسی کا رونا روتے ہیں جبکہ انہیں مرے ایک عرصہ بیت چکا اور اللہ تعالیٰ نے اس کے بجائے آپؐ کو ایک بہتر نعمت سے نوازا"۔(۱)

اگرچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ حلم و بردباری کا پیکر تھے اور اس سے بڑی چیزوں کو بھی نظرانداز کرجاتے تھے لیکن اپنی اس محترم اور محبوب شریک زندگی کے بارے میں ایک لفظ سننا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا ان کا چہرہ سرخ ہوجاتا اور غضب آمیز نگاہوں کے ساتھ حضرت عائشہ کو دیکھتے اور فرماتے۔

"خدا کی قسم (بہتر تو بہت دور کی بات ہے) اللہ تعالیٰ نے میرے لئے ان جیسا بھی

---

(۱) المحب الطبری والسمط الثمین

قرار نہیں دیا۔ وہ ایسے وقت میں مجھ پر ایمان لائیں جب لوگوں نے مجھے جھٹلایا۔ انہوں نے اس دور میں مجھ پر مال و دولت نچھاور کی جب لوگوں نے میری معاشی ناکہ بندی کردی تھی پھر میری تمام اولادوں میں خدا نے صرف انہیں بیٹے (قاسم) کی دولت سے نوازا"۔(۱)

یہ سن کر حضرت عائشہ حامی بھر لیتیں کہ اس کے بعد ان کے بارے میں کچھ نہیں بولیں گی۔ لیکن پھر کبھی جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ کو ان کی تعریفیں کرتے دیکھتیں تو ان میں برداشت کی طاقت نہ رہتی۔ اپنی اس کیفیت کا اظہار وہ اپنی زبانی بھی کرچکی ہیں۔

"میں نے کسی سے بھی ایسا حسد نہ کیا ہوگا جیسا خدیجہ سے کیا اور اس کے باوجود کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے ان کے مرنے کے بعد مجھ سے شادی کی اور انہیں فوت ہوئے بھی تین سال سے زیادہ کا عرصہ بیت چکا تھا لیکن وہ ہر وقت انہیں کے گن گاتے رہتے تھے"۔

واقعاً" صحیح ہے کہ ختم انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ اس وفادار ساتھی کو کبھی نہ بھولتے۔ اگر قربانی کرتے تو قربانی کا گوشت خدیجہ کے چاہنے والوں میں تقسیم کرادیتے اور فرماتے۔

"خدا کی قسم جو خدیجہ کو چاہتا ہے میں اس سے محبت کرتا ہوں"۔(۲)

یہ محبت اتنی شدید تھی کہ حضرت خدیجہ کی وفات کو دس سال سے زیادہ کا عرصہ بیت چکا تھا لیکن فتح مکہ کے موقعہ پر جب آپؐ نے مکہ میں کچھ دن قیام کرنا چاہا تو ایک ایسی جگہ تلاش کی جو حضرت خدیجہ کی قبر سے نزدیک تھی۔(۳)

---

(۱) استیعاب ابن عبدالبر' "زہرا" (استاد کتانی) نوٹ: یہ اس وقت کی بات ہے جب ابراہیم پیدا نہیں ہوئے تھے (۲) محب الطبری' السمط الثمین' استیعاب ابن عبدالبر (۳) تاریخ طبری جلد ۳' آٹھویں ہجری کے واقعات

حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام

جناب سیدہؑ سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ کی منفرد بیٹی تھیں آپ کے سن ولادت کے بارے میں اختلاف ہے۔

شیخ محمد یعقوب کلینی روایت کرتے ہیں کہ امام محمد باقر سے منقول ہے کہ حضرت فاطمہ زہراؑ پیغمبر اکرم کے رسالت پر مبعوث ہونے کے پانچ سال بعد اس دنیا میں تشریف لائیں۔

شیخ طوسی روایت کرتے ہیں کہ آپ کی ولادت باسعادت بعثت کے دو سال بعد ہوئی۔ البتہ اہلسنت کی روایتیں آپ کی ولادت کو بعثت سے پانچ سال پہلے بتاتی ہیں۔

جناب سیدہ نے مقدس ترین گھرانہ میں پرورش پائی۔ آپ کے والد ماجد فخر انسانیت اور ختم نبوت تھے جنہوں نے انسانیت کی سیاہ تاریخ کو الٹ کر رکھ دیا تھا۔

اور آپ کی والدہ ایک معزز و شریف گھرانہ کی بیٹی تھیں جنہوں نے جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کردیا تھا۔

آپ نے ایک ایسے دور میں آنکھیں کھولیں جب توحید کی آواز نے مدینہ سمیت پورے جزیرہ عرب کو ہلا دیا تھا۔ قریش ان کے جانی دشمن ہوگئے تھے لہٰذا آپ نے عہد طفولیت ہی سے مظلوم باپ کو اذیت و آزار میں دیکھا۔ ماں کی جدائی کے بعد جب خدا کے حبیب کو نرغہ اعداء میں تنہا پاتیں اور ان کے غم میں شریک ہوتیں تو اتنی گریہ وزاری کرتیں جس کی تاب آپ کے نازک جسم میں نہ تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کو نہ صرف قاسم کا غم دیکھنا پڑا تھا بلکہ جب قریش کی ستمگری سے مظلوم کی آہ نکلتی تو وہ تڑپ اٹھتے۔ نیز جب آپ دیکھتیں کہ آنحضرتؐ خانہ کعبہ میں نماز پڑھ رہے ہیں اور کوئی ان کے سر پر کوڑا کرکٹ الٹ رہا ہے' کوئی سڑی ہوئی اوجڑیاں ڈال رہا ہے اور کوئی مٹی پھینک رہا ہے تو آپ کا کلیجہ منہ کو آجاتا۔ اس حالت میں جب وہ گھر لوٹتے تو آپ خود ان کا سر دھلاتیں اور ساتھ ساتھ روتی رہتیں۔ آپ کو اس طرح دیکھ کر آنحضرتؐ کا غم بھی دوبالا ہوجاتا لیکن وہ یہ کہہ کر آپ کو دلاسا دیتے'

"بیٹی قادر مطلق نے اس دین کی یاری و نصرت کا بیڑا اٹھایا ہے"۔

فرض شناسی اور خدمت گزاری کا یہی ولولہ تھا جسے دیکھ کر حبیب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ نے آپ کو "باپ کی ماں" (۱) (ام ابیھا) کا خطاب دیا۔ اس لئے کہ جس کمی کو وہ یتیمی کے زمانے سے محسوس کررہے تھے اسے کسی حد تک حضرت خدیجہ ہی پورا کرپائیں تھیں اور ان کے بعد یہ سعادت بدرجہ اتم جناب سیدہ کو نصیب ہوئی۔ (۲)

جناب سیدہ کے نو اسماء گرامی زیادہ مشہور ہیں۔

فاطمہ' صدیقہ' مبارکہ' طاہرہ' سیدہ' زکیہ' محدثہ' زہرا اور ام النبی -- یہی وہ

---

(۱) عربی میں سگی ماں کیلئے والدہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اور "ام" اس ماں کو کہتے ہیں جس کی طرف بچہ عام مشکلات میں رجوع کرے (۲) اہل بیت (استاد توفیق ابو علم)

نفیس اور پاکیزہ نام ہیں جن سے سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ آپ کو یاد کرتے تھے۔ استاد توفیق ان اسماء عالیہ کو اپنی کتاب میں رقم کرنے کے ساتھ ساتھ ان مناسبتوں کو بھی ضبط کرتے ہیں جن میں جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ نے آپ کو ان ناموں سے یاد کیا۔

خود تاریخ لکھتی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ نے بے شمار مرتبہ آپ کو سیدہ (تمام عالم کی خواتین کی پیشوا) کہا۔ شروع میں آپ پوچھا کرتی تھیں کہ کیا حضرت مریم کو یہ شرف حاصل نہیں ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ جواب دیتے کہ وہ اپنے زمانہ کی سیدہ تھیں اور تم ہر دور اور ہر زمانے کی سیدہ ہو۔ (۱)

اسی طرح محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ کو نہ جانے کتنی مرتبہ یہ کہتے سنا گیا کہ "اللہ تعالیٰ تمہاری رضا میں راضی اور تمہارے غضب میں غضبناک ہے"۔

یہ سب اس لئے تھا کہ آپ نے خداوند عالم کی خوشنودی کو اس قدر ملحوظ خاطر رکھا تھا کہ آپ کی رضا رضائے الٰہی ہوگئی تھی اور آپ کا غضب خدائی غضب بن گیا تھا۔

صحیح بخاری کے مطابق جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ اکثر اوقات یہ فرماتے تھے۔

"فاطمہ میرے جگر کا ٹکڑا ہیں جس نے انہیں غصہ دلایا اس نے مجھے غصہ دلایا"۔

صحیح مسلم میں بھی اس سے ملتی جلتی روایت نظر آتی ہے۔

"فاطمہ میرا جگر گوشہ ہیں جس نے ان پر شک کیا اس نے مجھ پر شک کیا اور جس نے انہیں تکلیف پہنچائی اس نے مجھے دکھ دیا"۔

یہی مضمون صحیح نسائی، صحیح ترمذی اور الاصابہ (ابن حجر) میں مرقوم ہے اور اسے

---

(۱) امالی صدوق، استیعاب

اتنے لوگوں نے روایت کیا ہے کہ اگر لفظ کے لحاظ سے نہ سہی تو معنی کے حساب سے یہ روایتیں متواتر اور یقینی ہیں۔

اسی بارے میں ابوالفرج اصفہانی اپنی کتاب "اغانی" میں رقم کرتے ہیں کہ ایک دن امام حسن علیہ السلام کے پوتے عبداللہ ابن حسن مثنی جناب عمر ابن عبدالعزیز کے دربار میں تشریف لے گئے۔ حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے اس گرمجوشی سے ان کا استقبال کیا کہ لوگوں سے پوچھے بغیر نہ رہا گیا کہ یہ کون ہیں۔؟

خلیفہ نے جواب دیا کہ میں نے موثق ذرائع سے یہ حدیث سنی ہے کہ فاطمہ جگر گوشہ رسولؐ ہیں اور ان کو خوش کرنا جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ کو مسرور کرنے کے مترادف ہے اور ان کو ناراض کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کو ناراض کرنا ہے اور چونکہ یہ حضرت فاطمہ کے لخت جگر ہیں لہٰذا اسی احترام و تعظیم کے مستحق ہیں۔

خدا کے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ آپ کو بیحد چاہتے اور کبھی اپنے سے جدا نہ ہونے دیتے اور جب کبھی خدا کی راہ میں جہاد کرنے جاتے تو سب سے آخر میں حضرت فاطمہؑ سے وداع کرتے ---- پھر جب سفر سے واپس آجاتے تو شکرانہ کی نماز سے فارغ ہوتے ہی ملاقات کا شرف سب سے پہلے فاطمہ کو ہی نصیب ہوتا۔! (۱)

یہی وجوہات تھیں جن کی بناء پر حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کے نزدیک عورتوں میں جناب سیدہ اور مردوں میں حضرت امیرؑ سے زیادہ کوئی محبوب نہ تھا"۔ (۲)

ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ نے مولا امیرالمومنین علیہ السلام سے فرمایا۔

"اے علی" فاطمہ میرے جگر کا ٹکڑا' میری آنکھوں کا نور اور میرے دل کی

---

(۱) مستدرک حاکم' حلیہ خشنی کی روایت (۲) استیعاب ابن عبدالبر

ٹھنڈک ہیں۔ جس نے ان سے برائی کی اس نے مجھ سے بے ادبی کی اور جس نے انہیں خوش و خرم کیا اس نے مجھے مسرور کیا۔ پھر یہی ہیں جو میرے اہل بیت میں سب سے پہلے مجھ سے آملیں گی لہٰذا میرے بعد ان سے نیکی کرنا اور حسنؑ و حسینؑ میرے بچے اور میرے پھول ہیں اور جوانان بہشت کے سردار ہیں لہٰذا انہیں بھی عزیز رکھنا۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ یہ ارشاد فرما کر سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھادیئے اور یہ شہادت دی' "پالنے والے میں گواہی دیتا ہوں کہ ان کے چاہنے والوں کو چاہتا ہوں اور ان کے دشمنوں سے بیزار ہوں۔ ان کے دوستوں سے صلح میں ہوں اور ان کے دشمنوں سے جنگ میں۔ نیز ان کا دشمن میرا دشمن اور ان کا دوست میرا دوست ہے۔

انہی روایتوں کے درمیان کچھ ایسی روایتیں بھی ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب سیدہ اور خود ان کے شوہر اور والد بزرگوار بھی فقر و فاقہ میں مبتلا تھے۔ اور بسااوقات آسمان سے خوان نازل ہوتا تھا جس سے ان کی ضرورتیں پوری ہوتی تھیں۔ ان روایتوں میں ان آیات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے جن میں حضرت مریم پر خوان الٰہی نازل ہونے کا تذکرہ موجود ہے جسے دیکھ کر حضرت زکریا دنگ رہ جاتے تھے۔

ہم ان احادیث کے بارے میں سب سے پہلے یہی کہیں گے کہ یہ صحیح اور مکمل سند سے محروم ہیں۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اوس و خزرج جیسے مہربان اور مہمان نواز قبیلہ آنحضرتؐ اور ان کے گھروالوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ نیز حضرت خدیجہ کی ثروت' مالیات کی وصولی اور غزوات میں کامیابی کو مدنظر رکھتے ہوئے ان احادیث کو قبول کرنا صحیح نہ ہوگا۔

جو بات امکان پذیر ہے وہ یہ ہے کہ آپ لوگ اس دنیا کی لذتوں میں ذرہ برابر بھی رغبت نہ رکھتے تھے اور محتاج و نادار افراد کی مدد کو ہر چیز پر فوقیت دیتے تھے۔

بہرحال ان تمام روایتوں سے جنہیں شیعہ اور اہلسنت اپنی معتبر کتابوں میں رقم کرتے ہیں یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ جناب سیدہ علیہا السلام دنیا کی تمام خواتین پر ایک خاص شرف اور فضلیت رکھتی ہیں۔

یہ امتیاز انہیں اس لئے نہیں حاصل ہوا کہ وہ جناب خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ کی چہیتی بیٹی تھیں بلکہ اس لئے کہ انہوں نے اپنی گفتار و کردار میں خداوند عالم کی رضایت کو اس طرح مدنظر رکھا اور اس خلوص کے ساتھ تمام کام انجام دیئے جو نہ آنے والی خواتین کے لئے مقدور ہے اور نہ پہلے زمانہ کی عورتوں کے لئے ممکن تھا۔ شاید اسی لئے خداوند عالم نے جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ کی نسل کو انہی کے ذریعے باقی رکھا اور انہیں بارہ اماموں کی ماں ہونے کا شرف عطا کیا۔

کنزالعمال مستدرک الصحیحین، تاریخ بغدادی اور ذخائر عقبیٰ جیسی اہلسنت کی مستند کتابوں میں اس قسم کی کئی روایتیں ملتی ہیں۔ ان روایتوں میں حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ نسلوں کا سلسلہ آباء واجداد سے منسلک ہوتا ہے لیکن فاطمہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اس لئے کہ ان کے بچے میرے بچے اور میری نسل ہیں اور میری مٹی و طینت سے وجود میں آئے ہیں۔

ان تمام فضیلتوں کو اجاگر کرنے کا سبب یہ تھا کہ اسلام اپنی حقیقی صورت میں باقی رہے اور اس سنگین ذمہ داری کو صرف یہی ذریہ طیبہ پورا کرسکتی تھی لہٰذا جہاں ایک طرف سے رسالت کے دامن سے ان کے فضائل بیان کئے جاتے تھے وہاں دوسری طرف سے خداوند عالم کی بارگاہ سے بھی ان کی مودت و محبت کو تمام مسلمانوں پر فرض کردیا جاتا تھا۔

"کہہ دو اے پیغمبرؐ کہ ہم لوگوں سے رسالت کا کوئی صلہ نہیں چاہتے سوائے اس کے کہ ہمارے اہل بیت سے محبت کی جائے"۔

حضرت فاطمہؑ اور مدینہ کی طرف ہجرت

حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام کو بچپن ہی سے اپنے پدر گرامی کی مشکلات اور انہیں دی گئی تکلیفوں کا احساس تھا۔ لیکن شعب ابوطالب میں تین سال صعوبتیں سہہ کر جب آپ کی والدہ ماجدہ اور چچا ابوطالب اس دنیا سے چل بسے تو یہ احساس مزید بڑھ گیا۔ مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کے لئے پناہ کی کوئی جگہ باقی نہ بچی تھی۔ اور پھر قریش بھی ان کے قتل کے منصوبے ترتیب دے رہے تھے۔ اسی دوران ہجرت کا حکم آیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ مولائے متقیان کو امانتیں سپرد کرکے اور بستر پر سلا کر مدینہ ہجرت کرگئے۔ جانے سے پہلے انہوں نے حضرت امیر کو تاکید کردی تھی کہ امانتیں ادا کرنے کے بعد فواطم یعنی حضرت فاطمہ زہراؑ فاطمہ بنت اسد، فاطمہ بنت حمزہ اور فاطمہ بنت زبیر کو لیکر مدینہ آجائیں۔

حضرت امیر علیہ السلام نے امانتیں واپس کرنے کے بعد سفر کی تیاریاں کیں اور دن کی روشنی میں فواطم کے ہمراہ مدینہ کی راہ لی۔ اس مختصر سے قافلہ میں ابوواقد لیسی اور ام ایمن بھی تھے۔ ابوواقد سواریوں کو اس ڈر سے بھگائے چلے جارہے تھے کہ کہیں قریش ان کے تعاقب میں نہ آجائیں۔ لیکن امیرالمومنین علیہ السلام نے انہیں آہستہ چلانے کا حکم دیا اور فرمایا۔

"اے ابوواقد عورتوں پر کچھ رحم کرو۔ جس چیز سے تم ڈرتے ہو اس کے لئے خدا کافی ہے"۔

ابھی یہ لوگ کچھ دور ہی گئے تھے کہ قریش نے آٹھ منتخب شدہ گھڑسواروں کو ان کے پیچھے بھیجا۔ ان کے درمیان ایک نامی گرامی پہلوان بھی تھا۔ امیرالمومنین علیہ السلام نے جو انہیں آتا دیکھا تو ابو واقد کو سواریاں روکنے اور نیچے اترنے کے لئے کہا اور خود تلوار لیکر ان کے مقابلہ پر گئے۔ حضرت علیؑ کو تنہا دیکھ کر انہوں نے بہت مغرور اور رعب دار آواز میں کہا کہ شرافت سے ان عورتوں کو پلٹا دو ورنہ زبردستی سے یہ کام انجام دیا جائے گا۔

شیر خدا نے جواب میں مقابلہ کے لئے تلوار اٹھائی اور اس شان سے اس ملعون کے کندھے میں پیوست کی کہ وہ دو ٹکڑے ہوگیا۔ یہ عظمت و جلال دیکھ کر باقی افراد بھاگ کھڑے ہوئے۔ اور آپ نے دوبارہ مدینہ کا سفر شروع کیا۔ راستہ میں چلتے چلتے پیروں کا وہ حال ہوا کہ جب مدینہ کے اطراف میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ کی خدمت اقدس میں پہنچے تو آپ کی یہ حالت دیکھ کر ان کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

آپ لوگوں کا پہنچنا تھا کہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ شہر مدینہ میں داخل ہوئے اور جب سواری جناب ابو ایوب انصاری کے گھر کے پاس رک گئی تو

انہیں کے مہمان بنے۔ اس عرصہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ نے مہاجر و انصار کے ساتھ مل کر مسجد اور مسجد سے متصل ایک کالونی کا سنگ بنیاد رکھا۔ تاکہ خود آپ کی اور دوسرے مہاجرین کی رہائش کا ایک مستقل انتظام کیا جاسکے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ نے ان دونوں چیزوں کو بہت سادگی سے تعمیر کروایا۔

جناب سیدہؑ شہر مدینہ میں اسی بناوٹ اور آرائش سے پاک گھر میں رہنے کے لئے آئیں تھیں تاکہ آپ کے والد بزرگوار انصار کی حمایت میں اسلام کی دعوت کو پورے جزیرہ عرب تک پہنچاسکیں۔ سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ نے نہ صرف مہاجرین و انصار میں برادری اور اخوت برقرار کی تھی بلکہ حضرت امیرؑ کو اپنے لئے تنہا چھوڑ دیا تھا اور تمام لوگوں کو آگاہ کردیا تھا کہ علیؑ ہمارے بھائی اور ہمارے وصی و وارث ہیں۔

ابھی اس برادری کو کچھ زیادہ عرصہ بھی نہ گزرا تھا کہ آپؐ نے انہیں اپنا بھائی بھی بنالیا تھا۔ اس وقت آپ کی چہیتی بیٹی کی عمر پندرہ سال کی تھی۔ البتہ کچھ کمزور روایتیں اسے اٹھارہ سال بھی بتاتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مستشرقین کی ایک جماعت ان کمزور روایتوں پر تکیہ کرکے اسلام اور اسلام کے بزرگوں پر کیچڑ اچھالتی ہے۔ اور صاف واضح ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے یہ ملازم پیغمبر اسلامؐ اور ان کے گھرانہ کو داغدار کرنا چاہتے ہیں۔

انہی میں ایک شخص "لامنس" بھی ہے جو اپنی کتاب "زہراؑ" میں لکھتا ہے کہ حضرت زہراؑ میں وہ خوبیاں نہ تھیں کہ معزز گھرانوں سے ان کے رشتہ آتے لہٰذا اٹھارہ سال گزر جانے کے باوجود ان کا کوئی رشتہ نہیں آیا اور جب حضرت امیرؑ نے آپ سے خواستگاری کی تو آپ اس ڈر سے خاموش رہیں کہ کہیں کنواری نہ رہ جائیں۔

جو باتیں لامنس نے کہیں ہیں ان کا اشارہ بھی ان کمزور روایتوں میں نہیں ملتا۔ بلکہ تاریخ یہ لکھتی ہے کہ چونکہ آپ صورت وسیرت میں بے مثال تھیں لہٰذا شریف اور باثروت گھرانوں سے آپ کے رشتہ آتے تھے لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ یہ کہہ کر ٹال دیتے تھے کہ فاطمہ کا مسئلہ خدا کے سپرد ہے۔

اہلسنت کی کتابیں تفصیل سے لکھتی ہیں کہ حضرت ابوبکر و عمر نے بھی باری باری یہ تقاضا کیا لیکن انہیں بھی یہی جواب ملا۔ (۱)

(۱) جلاالعیون۔ عبداللہ ابن بشیر

حضرت امیر المومنینؑ سے آپ کی شادی

حضرت امیر علیہ السلام سے جناب سیدہ کی شادی عام مسلمانوں کی نظر میں کوئی تعجب آمیز بات نہ تھی وہ دیکھ رہے تھے جب حضرت علیؑ اپنا بچپن گزار رہے تھے تو آنحضرتؐ نے انہیں اپنا بیٹا بناکر ان کی پرورش کی۔ جب وہ جوان ہوئے تو دعوت ذوالعشیرہ کے موقعہ پر انہیں اپنا خلیفہ اور وصی کیا اور اخوت و برادری کے دن انہیں اپنا بھائی بنایا۔

جناب سیدہ بھی عہد طفولیت کا عرصہ اپنے اس چچا زاد بھائی کے ساتھ گزار چکی تھیں یہاں تک کہ آپ کی والدہ ماجدہ فوت کرگئیں اور امیر المومنین اپنے گھر واپس چلے گئے۔ اس دوران گھر کی تمام ذمہ داریاں آپ کے سر پر آپڑیں تھیں لیکن آپ نے بچپن کی تمام آسائشوں کو چھوڑ کر صرف پدر گرامی کی خدمت کو اپنا مقصد اور

ہدف بنالیا تھا۔ آپ شروع سے لیکر اب تک کی زندگی میں مولائے متقیان کو بہت نزدیک سے دیکھ چکی تھیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کے سب سے بڑے حامی تھے اور جن کی جانثاری اور شجاعت کے آگے بڑے بڑے پہلوان بھی لرز اٹھتے تھے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کے نزدیک جب ان کا مقام ومنزلت دیکھتیں تو عزت و احترام کے یہ جذبات مزید بڑھ جاتے لیکن آپ ان کا اظہار نہیں کرنا چاہتی تھیں اس لئے کہ پدر گرامی کے پاس رہ کر ان کی خدمت کرسکیں اور انہیں کچھ آرام و سکون فراہم کرسکیں۔

ابھی ہجرت کا دوسرا سال ہی گزرا تھا کہ متعدد جگہوں سے آپ کے رشتہ آئے اور جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ پر دباؤ بڑھ گیا لیکن انہوں نے بہت عمدگی کے ساتھ سب کو یہی جواب دیا کہ

"میں اس مسئلہ میں خداوند عالم کے حکم کا منتظر ہوں"۔

اس میں شک نہیں کہ ان امیدواروں میں حضرت امیر علیہ السلام بھی تھے لیکن ایک تو شرم و حیاء کی وجہ سے وہ ان چیزوں کا اظہار نہیں کرپاتے تھے دوسرے وہ ان دنیاوی وسائل سے برخوردار نہیں تھے جو ایک ہونے والے شوہر کے پاس ہونے چاہئے لیکن دوستوں نے انہیں ہمت دلائی کہ حضرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ کی خدمت میں حاضر ہوں اور حضرت فاطمہ زہرا کا تقاضا کریں۔

یہاں پر ضروری ہے کہ اس عقد کے بارے میں تاریخ اور سیرت کے اقوال کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جائے۔

"کشف القمر" میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہوتی ہے کہ انہوں نے فرمایا۔

"اگر باری تعالیٰ امیر المومنین علیہ الصلوۃ والسلام کو خلق نہ کرتا تو روئے زمین پر کوئی ایسا شخص نہ تھا جس سے فاطمہ کی شادی ہوسکتی۔

مناقب ابن شہر آشوب میں مرقوم ہے کہ صحاح ستہ میں مختلف انداز سے روایتیں ملتی ہیں جن کی اسناد ابن عباسؓ، عبداللہ ابن مسعود، اور براء ابن عازب جیسے صحابہ تک جاپہنچتی ہیں ان تمام روایتوں کا ماحصل یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ نے سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ سے حضرت فاطمہ کا رشتہ مانگا لیکن انہوں نے یہ کہہ کر منع کردیا کہ،

"میں اس مسئلہ میں خدا کے حکم کا انتظار کررہا ہوں"۔

اہلسنت کی ایک اور معتبر کتاب "طبقات کبریٰ" (ابن سعد) اس واقعہ کو قلمبند کرتی ہے۔ اور بعد کا ماجرا یوں بیان کرتی ہے۔

جب کچھ مسلمانوں نے مولائے متقیان پر زور ڈالا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کے پاس جائیں تو حضرت امیر علیہ السلام شرم کے مارے سرجھکائے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ آنحضرتؐ نے بڑی گرمجوشی سے انکا استقبال کیا اور آنے کا سبب دریافت کیا۔ علیؑ سرجھکائے بیٹھے تھے لہٰذا ادب کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے انہوں نے آہستگی سے عرض کی۔ "یا حضرت فاطمہ کی یاد میں تھا"۔

یہ سننا تھا کہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ نے اھلاً و مرحباً کہہ کر آپ کو سراہا۔

لہٰذا جب وہ واپس ہوئے اور دوستوں کو اس کی خبر دی تو انہوں نے آپ کو مبارکبادیں پیش کیں۔

ادھر خدا کے پیارے نبیؐ نے اس مسئلہ کو اپنی چہیتی صاحبزادی کے سامنے یوں بیان کیا'

"میں نے خدا وند کریم سے چاہا تھا کہ وہ اپنے محبوب ترین بندے سے تمہاری شادی کرے۔ علیؑ رشتہ لیکر آئے تھے اس بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔

جناب سیدہ نے بولنے سے مطلق پرہیز کیا تو آنحضرتؐ یہ کہتے ہوئے باہر نکلے کہ'

"ان کا سکوت ہی ان کی خوشنودی کا غماز اور ان کا اقرار بھی ہے"۔ بعد کا واقعہ "کشف القمہ" کی روایت میں "مناقب" سے اس انداز میں نقل کیا گیا ہے کہ جناب سیدہ کی رضایت دریافت کرنے کے بعد رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ نے مسلمانوں کو جمع کیا اور یہ ارشاد فرمایا۔

"خدا وند عالم نے مجھے حکم دیا ہے کہ اپنی بیٹی فاطمہ کی شادی علی سے کردوں اور میں نے یہ عقد چار سو مثقال چاندی میں باندھ دیا ہے"۔

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ نے امیر المومنین کی طرف توجہ کی اور ان کی رضایت طلب کی۔ انہوں نے اپنی خوشنودی کا اظہار کیا اور سجدہ شکر میں گر گئے۔

آنحضرتؐ نے ان کے لئے یہ دعا کی'

"اللہ تعالیٰ تم دونوں کو برکت دے اور کثرت کے ساتھ پاک و پاکیزہ نسل عطا فرمائے"۔

انس ابن مالکؓ اسی دعا کو ان الفاظ میں روایت کرتے ہیں۔

"خداوند عالم تم دونوں کو برکت دے' تمہارے اجداد کو سعادت نصیب کرے' تمہارے ملاپ کو مبارک ٹھہرائے اور تم سے صالح نسل وجود میں آئے"۔

"عقد سے فارغ ہوکر امیر المومنین علیہ السلام نے چار سو ستر درھم بعنوان مہر

آنحضرتؐ کی خدمت میں پیش کئے۔ یہ رقم آپ نے اپنا زرہ بیچ کر حاصل کی تھی۔ آنحضرتؐ نے اس میں سے کچھ مبلغ حضرت بلال کے حوالے کئے تاکہ جناب سیدہؑ کے لئے خوشبو خرید کر لائیں۔ پھر ڈھیر سارے درھم حضرت ابوبکر کو دیئے تاکہ لباس و پوشاک وغیرہ مہیا کر سکیں اور حضرت عمار یاسر کو ان کے ہمراہ کردیا۔ مہر کا کچھ حصہ ام ایمن کے حوالہ بھی کیا گیا تاکہ وہ گھر میں استعمال کرنے کی چیزیں خرید سکیں۔

اس طرح یہ شادی رجب کے مہینہ سن ۲ھ میں سادگی کے ساتھ انجام پائی۔ اور جناب سیدہ ایک نئے گھر میں آبسیں جسے تاریخ حارثہ ابن نعمان کا گھر بتاتی ہے۔ یہ گھر آپ کے پدر گرامی کے گھر سے ملا ہوا تھا۔ اور امیرالمومنین علیہ السلام نے اسے آپ کی سہولت کے لئے انتخاب کیا تھا۔

شیخ کلینی کی روایت کے مطابق شادی کے وقت جناب سیدہ کی عمر نو سال تھی جبکہ تاریخ طبری اسے دس سال بتاتی ہے۔ اس سلسلہ میں پندرہ سال کا بھی ایک مقولہ ملتا ہے۔

اپنی اس نئی زندگی میں جناب سیدہ کی مشکلات دو چند ہوگئیں تھیں۔ زندگی کے وسائل نہایت محدود تھے۔ نہ آپ کے والد گرامی کے پاس کوئی جائداد تھی جو آپ کے نام کرتے اور نہ آپ کے شوہر اتنے امیر تھے کہ آپ کے لئے کوئی خادمہ یا کنیز رکھتے۔ البتہ وہ گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے تھے لیکن غزوات اور سرایا انہیں بہت کم مدینہ میں رہنے دیتے تھے۔ لہٰذا وہ آپ کی طرف سے کافی پریشان رہتے تھے۔ خصوصاً" اب تو آپ ماں بھی بن چکی تھیں۔۔ ایک دن جناب ختمی مرتبتؐ مال غنیمت اور جنگی قیدی لئے لوٹے تو حضرت امیر علیہ السلام نے حضرت فاطمہ سے تقاضا کیا کہ وہ آنحضرت کے پاس جائیں اور اپنا مسئلہ ان سے بیان کریں شاید وہ کسی کو ان کی

خدمت پر مامور کردیں جناب سیدہ اس وقت چکی چلارہیں تھیں۔ وہ چلی تو گئیں لیکن تہذیبی روایات کے سبب اپنی حاجت بیان نہ کرسکیں اور یہ کہہ کر گھر لوٹ آئیں کہ آپؑ کو سلام کرنے حاضر ہوئی تھی۔ لہٰذا جب حضرت امیرؑ کو اس بات کا علم ہوا تو وہ خود بارگاہ رسالتؐ میں تشریف لئے گئے اور تمام ماجرا کہہ سنایا۔

جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ نے یہ کہہ کر جناب امیر سے معذرت کرلی کہ یہ مال غنیمت اور جنگی قیدی ان نادار افراد کا حق ہے جو بھوک سے تڑپ رہے ہیں۔

خدا کے حبیب نے منع تو کردیا لیکن جو ان کے دل پر گزری ہوگی وہ خدا بہتر جانتا ہے۔ لہٰذا اگلے دن تمام چیزوں کو چھوڑ کر وہ آپ دونوں کے پاس آئے اور فرمانے لگے کیا چاہتے ہو تمہیں ایک ایسی تسبیح تعلیم دوں جو تمہاری مشکلات کو حل کردے۔ جب حضرت امیر اور جناب سیدہ نے اپنی چاہت کا اظہار کیا تو پھر آپؐ نے تسبیح تعلیم دی جو ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر، ۳۳ دفعہ سبحان اللہ اور ۳۳ دفعہ الحمد اللہ پر مشتمل تھی۔ یہ تسبیح یومیہ نمازوں کی تعقیبات میں پڑھی جاتی تھی اور تسبیح زہراؑ کے نام سے مشہور ہوئی۔

جناب علی مرتضیٰؑ سے منقول ہے کہ یہ بہترین ورد اور بہترین وصیت تھی جو آنحضرتؐ نے ہمیں تعلیم دی تھی۔

اس تسبیح کے بعد آپ دونوں مشکلات کو آسانی سے جھیل جاتے تھے خود حضرت زہراؑ بھی جناب ختم الرسل صلی اللہ علیہ وآلہ کی حیات تک مسرور رہیں اور کبھی انہیں غمگین نہ دیکھا گیا۔

جناب سیدہ میں ہو بہو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ کی تمام خوبیاں اور خصلتیں

موجود تھیں۔ انہوں نے خدا کے حبیبؐ کی گفتار و کردار کو اپنی زندگی میں مجسم کرلیا تھا۔

حضرت عائشہ سے منقول ہے کہ

"سوائے ان کے والد گرامی کے میں نے کسی کو فاطمہ سے زیادہ سچا نہیں پایا"۔(۱)

سچائی اور صداقت کے ساتھ ساتھ آپ قناعت کی عمدہ مثال پیش کرگئیں اور اسی سادہ زندگی پر خوشنود رہیں اس لئے کہ آپ نے آنحضرتؐ کو یہ سفارش کرتے سنا تھا۔

"فاطمہ دنیا کی سختی پر صبر کرو تاکہ آخرت کی نعمت کو پاسکو"۔

وہ فرماتے تھے کہ بے نیازی یہ نہیں کہ انسان ثروت مند ہو بلکہ بے نیازی یہ ہے کہ انسان اس مال و متاع کی قید سے باہر نکلے۔

وہ حضرت علیؑ کو سمجھاتے تھے کہ'

"اے علیؑ اگر کوئی شخص دنیا و آخرت کے دوراہے پر کھڑا کردیا جائے تو اگر کہ وہ آخرت کو پسند کرے تو اس کا صلہ اور اجر جنت ہے۔ لیکن اگر وہ دنیا کو آخرت پر فوقیت دے دے تو اس کی سزا دوزخ کی آگ ہے"۔

انہی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ تھی کہ آپ مشکلات میں صبر سے کام لیتیں' آسائش میں شکر کرتیں اور خداوند عالم کی قضاء وقدر سے راضی رہتیں۔ اس لئے کہ آنحضرتؐ نے یہ بتایا تھا کہ اگر خدائے عزوجل کسی پر انعام و اکرام کرنا چاہتا ہے تو اسے مشکلات میں مبتلا کردیتا ہے۔

دختر گرامی رسول سخاوت میں بھی اپنی مثال آپ تھیں۔ انہوں نے سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ کی زبان مبارک سے سنا تھا کہ سخاوت جنت کے باغ

---

(۱) عمر بن دینار کی روایت' استیعاب ابن عبدالبر

کی ٹہنی ہے اور چونکہ خداوند خود سخی ہے اس لئے سخاوت مند بندوں کو پسند کرتا ہے۔

خصوصاً" جب یہ دو آیات نازل ہوئیں تو جناب سیدہ کی جود و بخشش بہت بڑھ گئی اور آپ سب کچھ نادار افراد کو دے دیتی تھیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے'

"جب تک اپنی محبوب اور دلپسند چیزوں میں سے خدا کی راہ میں نہ دو بھلائی سے کوسوں دور رہوگے"۔

"وہ لوگ ہمیشہ اپنے پر دوسروں کو فوقیت دیتے ہیں چاہے یہ چیز ان کے خسارے کا باعث ہی کیوں نہ ہو"۔

راویوں نے آپ کے اتنے فضائل بیان کئے ہیں جن سے یہ بات یقینی ہوجاتی ہیں کہ گفتار و کردار میں آپ آنحضرتؐ کی شبیہ تھیں۔

حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام اسی سیرت طیبہ پر زندگی گزار رہی تھیں کہ ہجرت کے تیسرے اور چوتھے سال خداوند عالم نے آپ کو امام حسن اور امام حسین علیہما السلام جیسے سعادت مند بیٹے عطا کئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ نے جو دعا کی تھی گویا وہ پوری ہوئی۔ اشرف المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ نے ان کے بارے میں جہاں بہت کچھ کہا وہاں یہ بھی فرمایا'

"یہ دونوں میرے بیٹے' امام ہیں چاہے قیام کریں چاہے صلح کریں"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کی ان سے شفقت اور محبت کی جو تصویر تاریخ پیش کرتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ازواج سے مایوس ہونے کے بعد آپ نے انہیں بیٹا بنالیا تھا۔

اگرچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ نے کنواری اور بیوہ ہر قسم کی خواتین سے

شادی کی تھی لیکن ان میں سوائے حضرت ماریہ قبطیہ کے کسی کے اولاد نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ماریہ کو ابراہیم نامی فرزند سے نوازا لیکن اسی خالق کی تقدیر تھی کہ ابراہیم سولہ مہینہ رہ کر اس دنیا سے رخصت ہوجائیں اور آنحضرتؐ کو غمگین اور محزون چھوڑ جائیں۔

بہرحال خدا کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وآلہ نے صراحت کے ساتھ اور کھل کر اس حقیقت پر سے پردہ ہٹادیا تھا کہ بیٹی کے ہونے کے باوجود یہ میرے بچے ہیں اور میری نسل ہیں۔ اور اسی لئے امام حسن و حسین علیہما السلام کو فرزند نبی کہا گیا۔

جناب سیدہ اس نعمت کو پاکر ایک عجیب خوش بختی کا احساس کرتی تھیں اور بہرحال خدا کی مشیت بھی یہی تھی کہ اشرف المرسلین کی نسل کی بقاء صرف آپ کے دامن سے ہو اور یہ چیز خود آپ کے شوہر کے لئے بھی باعث صد افتخار تھی۔

حضرت فاطمہؑ فتح مکہ میں

یوں تو حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام اسلام کی ہر کامیابی اور اس کے بڑھتے ہوئے عزت و وقار پر بہت مسرور تھیں لیکن جب ہجرت کے آٹھویں سال آپ نے قریش کے سردار ابوسفیان کو صلح و آشتی کی بھیک مانگتے دیکھا تو یہ مسرت اپنی انتہاء کو پہنچ گئی۔

ابوسفیان اس لئے آیا تھا کہ قریش کی خلاف ورزیوں کی معافی مانگ کر پرانے وعدے کو برقرار رکھ سکے لیکن جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ نے اسے جواب دینا بھی مناسب نہ سمجھا تھا۔ وہ مدینہ میں آکر بہت سے مسلمانوں سے پناہ کی درخواست کرچکا تھا لیکن اس کی بیٹی رملہ نے بھی جو آنحضرتؐ کی زوجہ تھیں، اسے امان نہ دی تھی۔

سب سے مایوس ہوکر آخرکار وہ اہل بیت کے دروازے پر آیا اور مولا امیر المومنین اور جناب سیدہ سے شفاعت کی درخواست کی۔ لیکن دونوں نے یہی جواب دیا کہ ہم آنحضرتؐ کے کاموں میں مداخلت نہیں کرتے۔ پھر بھی جب وہ مسلسل امیر المومنینؑ سے التجاء کرتا رہا تو آپ نے فرمایا کہ تمہارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ مسلمانوں کے مجمع عام میں صلح کا پیغام دیدو اگرچہ میری نظر میں یہ بھی زیادہ سود مند نہیں۔

یہ اعلان کرکے ابوسفیان مایوس و ناکام مکہ کی طرف لوٹ گیا۔ جناب سیدہ جانتی تھیں کہ سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ کا سکوت اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ وہ عنقریب مکہ پر چڑھائی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ لہٰذا ایسا ہی ہوا اور کچھ دنوں بعد آپ کچھ دوسری مسلمان خواتین کے ہمراہ شہر مکہ میں تشریف فرما تھیں وہی سرزمین جس نے آپ کے پدر گرامی کو اذیت و آزار دیکر اس سے نکال باہر کیا تھا۔ یہ وہی مکہ تھا جس کی سختیوں کی تاب نہ لاکر اماں خدیجہ اور چچا ابوطالب چل بسے تھے۔

اے کاش! یہ دونوں اس وقت ہوتے اور اپنی آنکھوں سے اسلام کی اس شان و شوکت کا نظارہ کرتے تو کتنا خوش ہوتے۔ ابھی آپ یہ سوچ رہی تھیں کہ اللہ اکبر ولاالہ الا اللہ کی گونجدار آوازیں چاروں طرف سے سنائی دینے لگیں اور خدائی فتح و نصرت کے نعرے بلند ہونے لگے۔ لات و منات لرز کر چکنا چور ہوگئے اور اسلحہ میں غرق خدائی فوج کے ہزاروں سپاہی پیشقدمی کرتے چلے جارہے تھے۔ کامیابی ہردم ان کے قدم چوم رہی تھی۔ (جنھوں نے اب سے چند سال قبل ظلم کی انتہا کردی تھی) ان موجوں میں تنکے کی طرح بہتے چلے جارہے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ ان فوجیوں کے درمیان تھے اور ان کی سربراہی بھی فرمارہے تھے۔ آنحضرتؐ نے مسلمانوں

کو مکہ میں خون بہانے سے روک دیا تھا اور کھلے دل کے ساتھ سب کو معاف کردیا تھا۔ اس بخشش تلے خود ابوسفیان اور اس کی بیوی جیسے شقی لوگ بھی آگئے تھے۔ جنہوں نے حضرت حمزہ کے لاشہ کے ساتھ درندگی کی حد کردی تھی۔ سوائے چند افراد کے کہ جن کا خون رائیگاں قرار دیا جاچکا تھا۔

فتح مکہ کے دو مہینہ بعد تک آپ اس شہر میں مقیم رہیں اور یکسوئی کے ساتھ یہ پورا عرصہ عبادت و ذکر میں گزار دیا۔ اس عرصہ میں لشکر اسلام نے مکہ کے اطراف کے علاقوں میں بھی اسلام کا پرچم لہرادیا تھا۔ اور ہوازن و ثقیف جیسے قدرت مند اور طاقتور قبیلوں کو بھی حنین کی وادی میں شکست دے کر ان کے مال و متاع پر قبضہ کرلیا تھا اور ان میں سے بہت سے لوگوں کو جنگی قیدی بنالیا تھا۔

دو مہینہ مکہ میں قیام کرکے حضرت زہراؑ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ کے ساتھ دوبارہ اسی مدینہ کی طرف واپس جارہی تھیں جو اب اسلام کا دارالخلافہ بن چکا تھا اور جہاں سینکڑوں وفد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ کی واپسی کا انتظار کررہے تھے۔

فتح مکہ اور اس کے بعد دو سال کا عرصہ آپ کے لئے نہایت اطمینان بخش اور سکون دہ تھا اور شاید یہ آپ کی زندگی کے خوشگوار دن تھے۔

مصحف فاطمہ علیہا السلام

یقیناً" صحابہ اکرام علیہم السلام نے جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ کی گفتار و کردار کو منعکس کیا اور انہی کے ذریعہ یہ احادیث تابعین اور بعد کے لوگوں کے لئے منتقل ہوئیں۔

اسی طرح اصولاً" خود اصحاب میں بھی انہیں زیادہ احادیث نقل کرنی چاہئے جو ہمیشہ آنحضرتؐ کے ساتھ رہتے تھے۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اہلسنّت کی احادیث کی بڑی بڑی کتابیں ایک ایسے صحابی کی روایتوں سے بھری پڑی ہیں جس نے آنحضرتؐ کی زندگی کے آخری سالوں میں مدینہ میں قدم رکھا اور وفات سے تین سال پہلے کا عرصہ مدینہ میں گزارا۔ یہ شخص نماز جماعت میں بھی بہت کم حاضر ہوتا تھا لیکن پھر بھی اہلسنّت کی احادیث ابوہریرہؓ سے

شروع ہوکر انہیں پر ختم ہوتی ہیں۔ اس کے برخلاف امیر المومنین جیسے صحابی جنہوں نے آغوش رسول صلی اللہ علیہ وآلہ میں آنکھیں کھولیں اور آخری دم تک آنحضرتؐ کے ساتھ رہے یہ لوگ بہت کم روایتیں نقل کرتے ہیں۔

یہ اور اس جیسی کئی وجوہات ہیں جنہوں نے ان کی احادیث کو خدشہ دار بنادیا ہے۔

بہرحال جہاں یہ طے شدہ بات ہے کہ امیر المومنینؑ نے ہزاروں احادیث نبویؐ نقل کیں وہاں شیعہ روایتوں میں مصحف فاطمہ کا وجود بھی یقینی ہے۔ اس صحیفہ کو ہمارے اماموں نے جناب سیدہ سے ورثہ میں حاصل کیا تھا یہ مصحف اس وقت تشکیل پایا جب آپ نے آنحضرتؐ اور علی مرتضیٰ سے سنی ہوئی احادیث اور اسرار و رموز کا ایک حصہ کتاب کی صورت میں محفوظ کرلیا تھا جسے ہمارے آئمہ اطہار نے "مصحف فاطمہ" کے نام سے یاد کیا۔

اس بارے میں ہمیں کئی موثق روایتیں ملتی ہیں جن میں امام عالی مقام مصحف فاطمہ اور اس کے علاوہ دو اور کتابوں "جفر و جامعہ" کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ان کتابوں کو بھی انہوں نے اپنے اجداد (علیؑ و فاطمہؑ) سے ورثہ میں لیا تھا۔ جو مختصر سی توضیح معصومین علیہم السلام ان کتابوں کے بارے میں دیتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کتابوں میں کائنات کے اسرار و رموز اور اس میں پیش آنے والے واقعات مرقوم ہیں۔ اور وہ تمام احکام و قوانین بھی درج ہیں جن کے لوگ محتاج ہوتے ہیں۔ اور معصومینؑ ان قوانین کو بیان کرتے ہیں۔

ان روایتوں میں یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ قرآن مجید سے اس قسم کے صحیفوں کا کوئی تعلق نہیں۔

بہرحال سرور کائنات کے لئے اتنا تو ممکن ہے کہ جناب سیدہ اور حضرت امیرؑ کو کائنات کے اسرار و رموز سے آشنا کردیں۔ اور اس میں ہونے والے واقعات سے بھی آگاہ کردیں۔ اس سب کے باوجود بھی محدثین کی ایک جماعت ان احادیث کو مکتب جعفری کی توہین و تذلیل کا ذریعہ بناتی ہے۔ اور ان کتابوں کا تعارف اس انداز سے کرتی ہے۔

"فاطمہؑ کے لئے ایک الگ قرآن ہے اور علیؑ کے پاس جفر وجامعہ جیسی کتابیں موجود ہیں جن میں قیامت تک کے حالات الفاظ و رموز کی صورت میں موجود ہیں اور انہی کتابوں کے ذریعہ یہ لوگ غیب پر سے پردہ اٹھاتے ہیں"۔ (۱)

حالانکہ اگر فرض کرلیا جائے کہ یہ روایتیں حضرت عائشہؓ ان کے والد یا دوسرے صحابہ کرام کی شان میں نازل ہوتیں تو یہی لوگ تصدیق و توثیق کی مہریں لگاتے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ امام سیوطی کی کتاب "اتقان" میں ایک روایت میں "مصحف عائشہ" کا ذکر ملتا ہے۔ اور یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ یہ مصحف قرآن شریف سے زیادہ مضامین پر مشتمل ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود یہ لوگ اس پر کوئی تبصرہ نہیں کرتے اور تمام الزامات کا نشانہ شیعہ اور ان کے اماموں کو بناتے ہیں حالانکہ جو روایتیں شیعوں نے ان صحیفوں کے بارے میں نقل کی ہیں وہ اتنی ٹھوس اور مختصر ہیں کہ کسی قسم کے شبہ یا تشویش کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ پھر یہ روایتیں اس سطح پر نہیں کہ شیعہ ضرور ان کے مضامین پر ایمان لائیں۔

(۱) مواقف (ایجی)، شرح جرجانی، الفصول المہمہ (ابن صباغ مالکی)، امام صادق (شیخ زہرہ)

حضرت فاطمہؑ اور
آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیماری

ہجرت کا دسواں سال ختم ہی ہوا تھا کہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شدید بیمار پڑ گئے۔ اس زمانے میں آپ سلطنت روم پر چڑھائی کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ بیماری کے پیش نظر آپؐ نے اس قافلے/ لشکر کی قیادت ایک ابھرتے ہوئے نوجوان کے سپرد کر دی جسے تاریخ اسامہ بن زید کے نام سے یاد کرتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام مسلمانوں کو جس میں چھوٹے بڑے مہاجر و انصار سب ہی شامل تھے، سختی سے اس میں شرکت کرنے کا حکم دیا اور خود اسامہ کو بھی جلد روانگی کا الٹی میٹم دیدیا۔

جناب ختم نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طبیعت روز بروز بگڑتی چلی جا رہی تھی لوگ اسے معمولی سا مرض سمجھ رہے تھے۔ لیکن جناب سیدہ جانتی تھیں کہ یہ بیماری جان لیوا ثابت ہوگی۔ اب تو مرض میں بھی اتنی شدت آچکی تھی کہ وہ کراہنے لگے تھے۔ پھر وہ اس نقاہت کے عالم میں چیختے کہ اسامہ کے لشکر کو ترتیب دو لیکن چند افراد کے علاوہ کوئی ان کی نہ سنتا۔ وہ قلم و دوات لانے کیلئے کہتے تاکہ انہیں گمراہی سے بچا سکیں لیکن یہ لوگ نہ صرف حکم عدولی کرتے بلکہ آپ کو ناروا نسبتیں بھی دیتے۔ پدر گرامی کی ان مصیبتوں کو دیکھ کر حضرت فاطمہ زہراؑ کا کلیجہ منہ کو آجاتا۔ والد گرامی کے ساتھ وہ بھی درد کی شدت کا احساس کرتیں اور بے ساختہ زبان سے "آہ" نکل جاتی۔

"بدایہ اور نہایہ" صحیح مسلم اور صحیح بخاری سے نقل کرتی ہیں کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیمار پڑ گئے تو تمام ازواج آپ کے گرد جمع ہو گئیں۔ اسی اثناء میں جناب سیدہ بالکل خاص آنحضرتؐ کے انداز سے چلتی ہوئی ان کے پاس پہنچیں۔۔۔ بیٹی کو پاس آتے دیکھ کر وہ آپ کی طرف متوجہ ہوئے' آپ کا استقبال کیا اور آپ کو اپنے پاس بٹھالیا۔

پھر آپ سے سرگوشی میں بہت کچھ کہتے رہے جسے کوئی بھی نہیں سن سکا۔ البتہ جناب سیدہؑ بہت غمگین اور افسردہ ہو گئیں تھیں۔ اور آنکھیں آنسوؤں سے نم تھیں۔ آپ کی یہ حالت دیکھ کر آنحضرتؐ نے پھر آپ سے سرگوشی میں کچھ کہا جسے سنکر آپ مطمئن ہو گئیں یہاں تک کہ مسکراہٹ بھی چہرے پر ابھر آئی۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہوتی ہے کہ انہوں نے جناب سیدہؑ سے اس بارے میں کافی پوچھ گچھ کی لیکن آپ نے یہ جواب دیا کہ میں کون ہوتی ہوں جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راز کو فاش کروں۔۔۔ البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم کی وفات کے بعد حضرت عائشہؓ کے بیحد اصرار پر آپ نے بتایا کہ انہوں نے مجھے اپنی وفات کی خبر دی تو میں افسردہ ہو گئی تھی لیکن جب یہ فرمایا کہ کیا تم اس پر راضی نہیں کہ پوری دنیا کی خواتین کی پیشوا ہو اور میرے اہل بیت میں تم ہی سب سے پہلے مجھ سے آملو گی' تو میں خوش ہو گئی۔ جب آنحضرتؐ پر درد کی شدت بڑھ گئی اور وداع کا وقت آ پہنچا تو علیؑ کو اپنے پاس بلایا اور بہت دیر تک تنہائی میں ان سے گفت و شنید کرتے رہے۔ (۱) اور جب خالق حقیقی سے جا ملے تو ان کا جسم اطہر جناب امیر علیہ السلام کے سینہ پر تھا۔ (۲)

وفات کی خبر سنتے ہی پورے شہر میں چیخ و پکار کی آوازیں بلند ہو گئیں اور لوگ غم واندوہ میں ڈوب گئے۔

ان میں سے ایک حضرت عمرؓ بھی تھے جو تلوار لئے لوگوں کو ڈراتے دھمکاتے اور یہ یقین دلاتے تھے کہ آنحضرتؐ ابھی زندہ ہیں اور حضرت موسیٰ کی طرح لوٹ آئیں گے۔۔۔۔ شاید کسی حد تک لوگوں نے ان کی بات پر یقین بھی کر لیا تھا یہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ آئے۔ انہوں نے آنحضرتؐ کے جنازے پر سے کفن ہٹایا' آپؐ کے پرنور چہرے پر ایک نگاہ ڈالی اور کپڑا واپس پلٹ کر مسجد کا رخ کیا۔ مسجد پہنچ کر انہوں نے عام لوگوں سے خطاب کیا اور جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرنے کی تصدیق کی۔ یہاں سے وہ حضرت عمرؓ اور ابوعبیدہؓ کے ساتھ ایک نامعلوم مقام کی طرف روانہ ہو گئے جس کے بارے میں تاریخ کچھ نہیں لکھتی۔ البتہ جب انہیں اطلاع ملی کہ انصار خلافت کا فیصلہ کرنے کیلئے سقیفہ بنی ساعدہ کے مقام پر جمع ہوئے ہیں تو یہ لوگ بھی سقیفہ پہنچ گئے۔ اس بارے میں ہم تفصیل سے مولائے متقیان کی سیرت میں بحث کریں گے۔

---

(۱) مستدرک حاکم حضرت ام سلمہ کی روایت (۲) طبقات ابن سعد

بہرحال امیر مومناں تجہیز و تکفین میں مشغول تھے اور یہ لوگ خلافت کی گتھیاں سلجھا رہے تھے۔

اس دوران حضرت فاطمہ کا بھی براحال تھا۔ غش کھا کر گر پڑتیں بے ہوش ہو جاتیں اور جب ہوش آتا تو مرحوم باپ کو یاد کرتیں۔۔۔ تکفین و تدفین کے بعد تو وہ اکثر اوقات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر کا رخ کرتیں۔ قبر اقدس پر نگاہ پڑتے ہی خود کو گرا لیتیں اور بیہوش ہو جاتیں۔ جب ہوش آتا تو تربت کی خاک اٹھاتیں اور اسے سونگھ کر اس قدر اشک بہاتیں کہ آنکھیں سوج جاتیں' آنسو خشک ہو جاتے اور جسم نڈھال ہونے لگتا اور زبان پر بے ساختہ یہ کلمات آجاتے۔

"جو غم اور جو مصیبتیں مجھ پر پڑی ہیں اگر وہ دن کی روشنی پر پڑتیں تو وہ سیاہ و تاریک رات میں بدل جاتی"۔

اور یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپ صرف ڈھائی مہینہ زندہ رہیں۔ اس پورے عرصہ میں آپ نے اطمینان کا سانس لیا نہ مسکرائیں۔ آپ کی گریہ وزاری دن و رات جاری رہتی جسے سن کر پتھر دل بھی موم بن جاتے تھے یہاں تک کہ لوگ عاجز آجاتے تھے اور آپ سے آہستہ رونے کی درخواست کرتے تھے۔

کچھ روایتوں کے مطابق مولا علی علیہ السلام نے آپ کیلئے "بقیع" میں ایک کمرہ بنا دیا تھا جسے "بیت الاحزان" (غم واندوہ کا گھر) کا نام دیا گیا ہے۔ آپ اس میں دن و رات روتی رہیں۔ یہاں تک کہ پدر گرامی سے جاملیں۔ (۱)

شیخ صدوقؒ روایت کرتے ہیں کہ جب سرکار رسالت مآبؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دارفانی سے کوچ کر گئے تو حضرت بلال کو اذان دینے سے روک دیا گیا۔ انہوں نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ہرگز اذان نہ دیں گے۔ لیکن جب دختر گرامی رسولؐ کی یہ فرمائش حضرت بلالؓ تک پہنچی کہ

---

(۱) اہل بیت (استاد توفیق ابو علم)

"میں اپنے مرحوم والد کے موذن کی آواز سننا چاہتی ہوں" تو وہ مسجد تشریف لے گئے اور اذان دینا شروع کی۔ انہوں نے جب اللہ اکبر کہا تو آپ نے گذرے دنوں کو یاد کیا۔ اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ لیکن جب انہوں نے آنحضرتؐ کے رسول ہونے کی شہادت دی تو آپ غش کھا کر گر پڑیں اور بیہوش ہو گئیں۔۔۔۔۔ کسی نے حضرت بلال سے کہا کہ "بس کرو تم اذان دیتے ہو اور دختر رسول کی جان جاتی ہے"۔ تو حضرت بلال رک گئے۔ جب آپ ہوش میں آئیں تو اذان پوری کرنے کی درخواست کی لیکن انہوں نے آپ سے معذرت کرلی اور پھر کبھی اذان نہ دی۔

اس میں شک نہیں کہ آنحضرتؐ کی جدائی کا جو صدمہ حضرت فاطمہ کو پہنچا وہ ایک الگ نوعیت کا ہے اور شاید بے نظیر بھی ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ اس دنیا میں حقیقی اور صحیح آہ وزاری کرنے والے صرف پانچ افراد تھے۔ حضرت آدم و یعقوب و یوسف اور حضرت فاطمہ بنت محمدؐ اور امام سجادؑ۔

حضرت آدم اس ڈر سے روتے تھے کہ خدا نے انہیں جنت سے نکال باہر کیا تھا۔ حضرت یعقوب اپنے بیٹے کی جدائی پر روتے تھے اور وہ بھی اتنا کہ ان کی آنکھوں کا نور جاتا رہا تھا۔ اسی طرح حضرت یوسف بھی باپ کے فراق میں اتنی دھاڑیں مارتے تھے کہ تمام قیدی تنگ آ جاتے تھے۔ پھر حضرت سید سجاد اپنے مظلوم اور بے کس باپ پر تیس سال روئے۔ جب ان سے کھانے کیلئے کہا جاتا تو فرماتے کہ کس طرح کھاؤں کہ میرے باپ کو بھوکا شہید کیا گیا اور جب پانی پیش کیا جاتا تو وہ مظلوم حسینؑ کی پیاس کو یاد کرتے۔ اسی طرح حضرت فاطمہ زہراؑ بھی اپنے والد کے فراق میں روتی تھیں۔ آپ اتنا روتیں کہ پورا مدینہ پریشان ہو جاتا اور مجبوراً آپ قبرستان میں جاکر آہ وزاری کرتیں۔

خلافت اور میراث کے بارے میں آپ کا نقطہ نظر

جناب سیدہ اور عام مسلمانوں کی نظر میں خلافت کے حقدار صرف حضرت امیر علیہ السلام ہی تھے۔ اس لئے کہ انہوں نے اس بارے میں جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اتنی احادیث سن لی تھیں کہ اس بارے میں شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی تھی۔ اور شاید اسی لئے ایک ایسے وقت سے فائدہ اٹھا کر جب اشرف المرسلین کا جسم اطہر روئے زمین پر تھا اور گھر والے تجہیز و تکفین میں مشغول تھے' ایک گروہ نے خلافت کی گتھیوں کو سلجھا لیا تھا۔ اس گروہ کی سربراہی حضرت ابوبکر و عمر و ابو عبیدہ کر رہے تھے۔ چونکہ یہ حادثہ بہت تلخ اور پراسرار طور پر سامنے

آیا تھا اس لئے جناب سیدہ نے اس بارے میں بہت سخت اور مضبوط موقف اپنایا۔ انہوں نے امیرالمومنین علیہ السلام کے حق کا دفاع کیا اس لئے کہ بخوبی جانتی تھیں کہ خالص محمدی اسلام کو صرف علیؑ ہی آگے بڑھا سکتے ہیں۔

بہرحال آپ نے اس ضمن میں "فدک" اور اپنے دوسرے حقوق کا مطالبہ کیا اور اگر خلافت کا مسئلہ نہ ہوتا تو شاید یہ لوگ تمام حقوق بحال بھی کر دیتے لیکن جانتے تھے کہ اتنا زبردست موقف اختیار کرنے کے بعد ان چیزوں کے واپس کرنے سے ان کا مطالبہ مزید قوی ہو جائے گا۔ پھر فدک بھی کوئی معمولی چیز نہ تھا بلکہ اتنی بڑی جائیداد تھی جس سے ہر سال بہت بڑی مقدار میں دولت فراہم ہوتی تھی۔ اس چیز کا جائزہ کہ فدک اور دوسرے حقوق کا مطالبہ دراصل اسلامی خلافت سے دستبردار ہونے کا بہانہ تھا ہمیں اس خطبہ میں دیکھنا چاہئے جو آپ نے مہاجرین و انصار کے مجمع عام میں دیا تھا۔ وہی خطبہ جس نے مسلمانوں کے ضمیر جھنجھوڑ ڈالے تھے اور ان پر ثابت کر دیا تھا کہ ان کی روش قرآن کے منافی ہے۔ یہی نتیجہ ہم اس مقام پر بھی نکال سکتے ہیں جب آپ کے ایک فرزند حضرت موسیٰ کاظم علیہ السلام نے مہدی عباسی سے اپنا حق مانگا تھا۔

تفصیل کچھ یوں ہے کہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے جب دیکھا کہ مہدی عباسی مظلوم کو اس کا حق دے رہا ہے تو آپ نے بھی فدک واپس کرنے کیلئے کہا۔ اس نے جب فدک کی حدود متعین کرنے کیلئے کہا تو امام علیہ السلام نے وہ لمبا چوڑا نقشہ کھینچا جس میں بہت سی اسلامی ریاستیں آجاتی ہیں یہ دیکھ کر اس نے کہا کہ یہ تو بہت زیادہ ہے لہٰذا اس بارے میں سوچنا پڑے گا۔ (۱)

مہدی عباسی کا یہ جواب اس بات کا نشانگر ہے کہ فدک لوٹا دینا اسلامی خلافت

---

(۱) علی ابن اسباط کی روایت

سے دستبردار ہونے کے مترادف تھا۔ اور امام بھی جانتے تھے کہ یہ لوگ جنہوں نے اپنے آباؤاجداد کی روش اختیار کی ہوئی ہے، کبھی بھی خلافت سے دستبردار نہیں ہوں گے۔

لہٰذا ثابت ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا علیہ السلام کی تمام تر توجہات کا مرکز وہ اسلامی خلافت تھی جو نااہل افراد کے ہاتھوں میں چلی گئی تھی۔

اگرچہ انصار نے بھی اپنے بزرگ سعد ابن عبادہ کو خلیفہ بننے کیلئے نامزد کر دیا تھا لیکن یہ فیصلہ انہوں نے اس وقت کیا جب انہیں یقین ہو چلا تھا کہ یہ حق وصی رسول سے چھین لیا گیا ہے اور دوسرے اس پر قبضہ جما رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر انہوں نے بھی اپنوں میں سے ایک کو آگے بڑھا دیا۔ اس بارے میں خود انصار سے کچھ روایتیں ملتی ہیں جو ہماری بات کی تائید کرتی ہیں۔

کچھ روایتوں میں ملتا ہے کہ مولائے متقیان جناب سیدہ کو لیکر رات کے اندھیرے میں انصار کے گھروں پر جاتے تاکہ آپ انصار کو قائل کر سکیں۔ ان روایتوں میں ملتا ہے کہ وہ زیادہ تر انصار دخترگرامی رسولؐ کو یہی جواب دیتے کہ اب تو ہم حضرت ابوبکر سے بیعت کر چکے ہیں اگر آپ کے شوہر پہلے آتے تو ہمیں کوئی مضائقہ نہ ہوتا اس پر امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے کہ کیا رسولؐ اللہ کو کفن و دفن کے بغیر عورتوں اور بچوں کے حوالہ کر دیتا تاکہ ریاست کے جھگڑے نپٹا سکوں۔

اگرچہ کچھ شیعہ حضرات بھی اس قسم کی روایتوں کو ان کی کمزور اسناد کے ہمراہ نقل کرتے ہیں لیکن اس مسئلہ میں جو بات قابل قبول ہے وہ یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کی صاحبزادی نے اپنے مذہبی فریضہ کے پیش نظر مہاجر و انصار کو جمع کر کے انہیں احادیث نبویؐ یاد دلائی ہوں گی۔ اور حق بات کا پرچار کیا ہوگا۔۔۔۔ لیکن جب یہی باتیں آپ

کھلے عام مسجد میں کر چکی تھیں تو ضرورت نظر نہیں آتی کہ خفیہ طور پر اس کیلئے انصار کے گھروں کے چکر لگائیں۔ پھر ان حالات میں جبکہ لوگ کفر کی طرف پلٹ رہے تھے۔ حضرت امیر علیہ السلام نے اپنا حق واپس لینے کی ذرا بھی کوشش نہ کی تھی۔ البتہ انہوں نے دشمن کا کریہہ چہرہ ضرور دکھا دیا تھا تاکہ لوگ حق باطل اور صحیح و غلط میں تمیز کر سکیں۔ حضرت فاطمہ زہرا علیہ السلام کا عظیم الشان خطبہ' خلافت کے بارے میں آپ کا خاص نقطہ نظر اور فدک اور دوسرے حقوق کا مطالبہ' سب اسی سلسلہ کی کڑیاں تھیں۔

فدک کے بارے میں

حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے بارے میں جناب سیدہؑ کا موقف بیان کرنے کے بعد ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ فدک کے بارے میں بھی کچھ گفتگو کریں، جس کی وجہ سے شیعہ سنی حضرات میں کافی لے دے ہو چکی ہے۔

"فدک" سرزمین حجاز اور شہر مدینہ کے درمیان واقع دیہاتوں میں سے ایک سرسبز و شاداب دیہات ہے۔ جب امیر المومنین علیہ السلام نے باب خیبر کو اکھاڑ پھینکا اور مرحب سے زبردست کو مار گرایا تو فدک کے لوگوں پر ایک عجیب خوف و ہراس طاری ہو گیا۔ لہٰذا اس سے پہلے کہ مسلمان ادھر کا رخ کرتے انہوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو پیغام بھجوایا کہ

"ہم آپ کے حکم کے تابع اور آپ کے آگے تسلیم ہیں اگر چاہیں تو ہم سے بھی وہی

معاملہ کرلیں جو خیبر والوں سے کیا تھا یعنی ہمیں رہنے دیں اور زمیں رہن پر دیدیں۔"

جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی یہ تجویز قبول فرمائی اور اس رو سے خیبر تو مسلمانوں کا ہوگیا لیکن فدک جو جنگ و جدل کے بغیر حاصل ہوا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملکیت میں آگیا۔۔۔۔۔ کچھ عرصہ بعد یہ آیہ شریفہ نازل ہوئی۔

"اور اپنے قرابتداروں کا حق انہیں ادا کردو۔"

اور آنحضرتؐ کو بارگاہ ربوبی سے حکم ہوا کہ یہ باغ حضرت فاطمہ زہراؑ کو دیدیا جائے لہٰذا انہوں نے جناب سیدہؑ کو بلایا اور فدک ان کے حوالے کر دیا۔ حضرت زہراؑ نے اسے قبول کیا۔ آپ اس میں سے ضرورت کے مطابق لے لیتی تھیں اور باقی کو سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیتیں تاکہ مستحق اور محروم لوگوں کی بہتر طریقہ سے کفالت کی جاسکے۔

اس حقیقت کی تصدیق شیعوں کی تمام روایتیں اور اہلسنت کی احادیث کے دفتر بھی کرتے ہیں۔

امام سیوطی اپنی کتاب درمنثور میں اس بارے میں بزاز، ابویعلیٰ، ابن خاتم اور ابن مردویہ کے حوالوں سے مشہور صحابی حضرت ابو سعید خدری سے روایت کرتے ہیں۔ محدثین کی ایک اور جماعت اس بارے میں ابن عباسؓ سے بھی روایت کرتی ہے۔

ابن ابی الحدید معتزلی "شرح نہج البلاغہ" میں دو روایتیں نقل کرتے ہیں جو بعد کے واقعات پر بھی روشنی ڈالتی ہیں۔ ان روایتوں کے مطابق جناب خاتم النبین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے اسے حضرت فاطمہ سے واپس لے لیا تھا۔ اور جب آپ نے ان سے اس کا مطالبہ کیا تو انہوں نے جواب دیا۔

"میں نے آنحضرتؐ کو کہتے سنا ہے کہ ہم انبیاء کوئی ورثہ نہیں چھوڑتے۔"

آپ نے فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زندگی میں اسے مجھے بخش دیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے آپ سے شاہد طلب کئے۔ آپ نے حضرت امیرؑ اور اپنی کنیز ام ایمن کو پیش کیا۔۔۔ اس طرف سے حضرت عمرؓ اور عبدالرحمٰن ابن عوف نے اس کے برخلاف شہادت دی کہ رسولؐ اللہ فدک کو مسلمانوں کے درمیان تقسیم کرتے تھے۔

حضرت ابوبکرؓ نے فیصلہ دیا کہ دونوں فریق صحیح کہتے ہیں کیونکہ فدک جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتی ملکیت تھا اور اسے آپ حضرت فاطمہؑ کی ضروریات پوری کرنے کے بعد مسلمانوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔

کچھ روایتوں کے مطابق جب حضرت علی علیہ السلام اور ام ایمن کی گواہی کو یہ کہہ کر رد کر دیا گیا کہ علیؑ کی اس مسئلہ میں ذاتی منفعت ہے اور ام ایمن عورت ہیں' تو آپ نے امام حسن و حسین علیہ السلام کو پیش کیا لیکن ان کے بارے میں یہ کہا گیا کہ یہ بچے ہیں۔

بعض روایتوں میں یہ ملتا ہے کہ حضرت علیؑ اور ام ایمن کی گواہی کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے آپ کے حق میں فیصلہ کر دیا تھا اور رقعہ بھی لکھ دیا تھا لیکن حضرت عمرؓ نے اسے آپ سے چھین کر پھاڑ ڈالا۔

یہ اس مسئلہ میں وارد ہونے والی روایتوں پر ایک اجمالی سی نگاہ ہے اور اگرچہ یہ روایتیں نقص سے خالی نہیں لیکن چونکہ تمام محدثین نے انہیں ہی روایت کیا ہے اور انہی پر تکیہ کیا ہے لہٰذا ہم صرف انہیں مدنظر رکھ کر حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے رویہ کا جائزہ لیں گے جنہوں نے مولائے متقیان اور امام ہادیان کی گواہی قبول نہ کر کے

قرآن و سنت کی بے حرمتی کی۔ اور بہرحال صرف قرابتداری سے شہادت پر آنچ نہیں آتی۔ کیا ان لوگوں نے خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ کہتے نہ سنا تھا کہ' "علیؑ حق کے ساتھ ہیں اور حق علیؑ کے ساتھ ہے۔ علیؑ قرآن کے ہمراہ ہیں اور قرآن علیؑ کے ہمراہ"۔

یہ دونوں حضرات یہ اور اس جیسی سینکڑوں احادیث سن چکے تھے جن سے ان کے نزدیک ثابت ہوچکا تھا کہ علیؑ کا مقام اس سے کہیں بلندوبالا ہے کہ انہیں شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ پھر مالی جھگڑوں میں اسلامی قضاوت کا بنیادی طریقہ کار یہ ہے کہ اگر مدعی ایک عادل شاہد اپنے ساتھ لے آئے تو قاضی اسے قسم کھانے کا موقع فراہم کرتا ہے اور اگر وہ قسم کھالے تو اس کے حق میں حکم کر دیا جاتا ہے۔۔۔۔۔ اور حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ بخوبی اس حکم کو جانتے تھے کیونکہ آئے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مسند قضاوت پر بیٹھے دیکھتے تھے۔

ایک سوال جو ذہن میں ابھر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ جناب سیدہؑ اس ادعاء میں حق پر تھیں اور اس بات کو تمام مسلمان جانتے تھے لہٰذا آپ نے کیوں مسلمانوں کو گواہی کی زحمت نہ دی اور صرف حضرت امیر علیہ السلام یا اپنے بچوں کو پیش کیا۔؟

جواب یہ ہے کہ بات یہ نہ تھی کہ آپ کے پاس شاہدوں کی کمی ہو کیونکہ اگر اور لوگ شہادت نہ بھی دیتے تو حضرت سلمان فارسی' ابو ذر غفاری اور مقداد جیسے وفادار اصحاب تمام خطروں اور دھمکیوں کو مول لے کر بھی گواہی دیتے۔ بلکہ آپ یہ دکھانا چاہتی تھیں کہ ان لوگوں نے امیر المومنین علیہ السلام اور امام حسن و حسین کی گواہی کو جھٹلا کر تمام احادیث کی خلاف ورزی کی ہے۔ پھر یہ لوگ بھی آپ کے حق کی تردید کیلئے ایک ایسی حدیث سامنے لائے جسے صحابہ کے اتنے بڑے مجمع اور اتنی

بڑی تعداد میں صرف حضرت ابوبکرؓ ہی سن سکے تھے۔ اور سوائے ابو ہریرہ کے کسی نے اس حدیث کو آنحضرتؐ سے براہ راست روایت نہیں کیا۔

مظفری "دلائل صدق" میں رقمطراز ہیں کہ

"جو حدیث مسند احمد کی پہلی جلد میں موجود ہے اس کے مطابق حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ابوبکرؓ جو سچ بات بولتے ہیں فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ کہتے سنا'

"کوئی نبی بھی میراث نہیں چھوڑتا اور جو کچھ اس سے متعلق ہوتا ہے وہ مسلمانوں کے فقراء و نادار افراد میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔"

مظفری لکھتا ہے کہ خود یہ روایت اس بات پر دلیل ہے کہ یہ حدیث صرف حضرت ابوبکرؓ نے آنحضرتؐ سے روایت کی ہے۔ اور کیونکر اس دور کے مفتی حضرات نے صرف ایک صحابی سے نقل کئے جانے کے باوجود اسے فتووں کی بنیاد بنا لیا ہے۔۔۔۔۔؟

کچھ روایتوں میں یہ تک ملتا ہے کہ فدک جو محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتی ملکیت تھا' ان کی وفات کے بعد اسے حضرت ابوبکرؓ نے ہتھیا لیا تھا۔(۱)

اس قسم کی احادیث میں حضرت فاطمہ زہراؑ کے ادعاء کو ایک اور حدیث نبویؐ کے ذریعے رد کیا گیا ہے۔

سنن ابو داؤد میں مرقوم ہے کہ جب حضرت فاطمہ علیہا السلام اپنی میراث کا مطالبہ کرنے کیلئے حضرت ابوبکرؓ کے پاس تشریف لے گئیں تو انہوں نے کہا کہ انہوں نے جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے کہ'

"اگر خداوند عالم نبی کو کوئی چیز بخشتا ہے تو وہ اس شخص کی ہوتی ہے جو ان کے

---

(۱) تاریخ خلفاء (امام سیوطی)

بعد آئے۔"

یہی دلیل "کنز العمال" امام احمد' ابو داؤد' ابن حریز اور بیہقی کے حوالوں کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ سے نقل ہوتی ہے۔ لیکن "دلائل صدق" میں مظفری اسی پر اکتفاء نہیں کرتے بلکہ یہ بھی رقم کرتے ہیں۔

"ایسا لگتا ہے کہ خیبر بھی حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی ذاتی جائیداد بن گیا تھا اس لئے کہ صحیح بخاری' صحیح مسلم اور مسند احمد (جیسی معتبر کتابیں) حضرت عمرؓ کے بارے میں یہ لکھتی ہیں کہ انہوں نے فدک کو اپنے ذاتی استعمالات کے واسطے رکھ چھوڑا تھا۔ وہ یہ کہتے تھے کہ فدک و خیبر دونوں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذاتی استعمالات کی چیزیں تھیں لہٰذا ان کے بعد اسی کی ہونی چاہئے جو ان کی جگہ لے لے"۔۔۔

مظفری نتیجہ گیری کرتے ہیں کہ فدک و خیبر ان دونوں افراد کی نذر ہو گیا تھا۔

بہرحال ان دو مختلف احادیث کے ذریعے جناب سیدہؑ کے دعویٰ کو جھٹلایا گیا۔ البتہ ان میں پہلی روایت زیادہ مشہور ہے۔ یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ ان دونوں احادیث کی واحد سند حضرت ابوبکر صدیقؓ ہیں۔

ہم اس بارے میں یہی کہیں گے کہ یہ بات جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شایان شان نظر نہیں آتی کہ وہ ان آیات الٰہی کے خلاف کوئی بات کریں جو صراحت کے ساتھ حق وراثت کو انبیاء اور دوسرے لوگوں میں ثابت کرتی ہوں۔

پھر کیونکر ممکن ہے کہ یہ حکم اتنے خفیہ انداز سے صادر ہو کہ صحابہ کی اتنی بڑی جماعت میں صرف حضرت ابوبکرؓ کو اس کا علم ہو۔۔۔ حالانکہ سنت نبویؐ یہ تھی کہ

جب وحی اترتی تھی اور آپ قانون بناتے تو پہلے تمام افراد کو جمع کرتے پھر اس قانون کو بیان کرتے۔ اور اس سے فرق نہیں پڑتا تھا کہ خطاب صرف آپؐ کی ذات سے ہو یا سب سے' اس لئے کہ قانون تو عام تھا۔

یہ بات بھی بعیدازامکان نظر آتی ہے کہ حضرت علی علیہ السلام جنہیں خود آنحضرتؐ نے علم کا دروازہ کہا ہو' اس حدیث سے ناواقف ہوں۔

سوال یہ ہے کہ کیا آنحضرتؐ نہیں جانتے تھے کہ یہ چیز آپؐ کی امت میں تفرقہ کا باعث بنے گی اور آپؐ کی اس صاحبزادی کے غضب کو فراہم کرے گی جن کے غضب کو خود آپؐ نے خدائی قہر سے تشبیہ دی تھی۔۔۔؟

ان اعتراضات کی روشنی میں ہر وہ شخص جو کھلے دل سے خدا اور رسول پر ایمان رکھتا ہو اور خدا و رسول کی نظر میں علیؑ و فاطمہؑ کے مقام و منزلت کو پہچانتا ہو' یقیناً حضرت ابوبکرؓ کی طرف نسبت دی جانے والی ان احادیث کو بے بنیاد اور جھوٹ کہے گا۔

بہرحال دختر گرامی رسول نے فدک اور دوسرے حقوق کا مطالبہ کیا جس سے ان کی مشکلات اور انہیں دیئے جانے والے ازیت و آزار میں خاطر خواہ اضافہ ہوا البتہ انہیں مسند و منبر رسولؐ کے چھن جانے کا بے حد افسوس تھا ورنہ فدک اور دوسری چیزیں آپ کیلئے چنداں اہمیت نہ رکھتی تھیں۔ پھر آپ نبوت کے دامن سے یہ بھی جان گئی تھیں کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد صرف چند دنوں کی مہمان ہیں۔

حضرت زہراؑ کا خطبہ مسجد نبوی میں

اس سے پہلے ہم وراثت اور دوسرے حقوق کے سلسلے میں بنت رسولؐ کے موقف کو تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔ اب ضروری سمجھتے ہیں کہ ایک اجمالی سی نگاہ اس طویل و عریض اور عظیم الشان خطبہ پر بھی ڈالی جائے جو آپ نے آنحضرتؐ کی وفات کے بعد مسجد نبویؐ میں دیا تھا۔ اس خطبہ نے مسلمانوں کے ضمیر جھنجھوڑ ڈالے تھے اور انہیں ہلا کر رکھ دیا تھا۔ یہ خطبہ ہمیں آپ کے پوتے جناب عبداللہ ابن حسین ابن حسن مجتبیٰ روایت کرتے ہیں۔

حمد و ثناء الٰہی بجا لانے کے بعد اور درود و سلام بھیجنے کے بعد آپ خدا کی نعمتوں کو گنواتی ہیں اور اپنی گفتگو کا باقاعدہ آغازیوں کرتی ہیں۔

"اے لوگو! تم خدا کے بندے ہو۔ باری تعالیٰ تمہیں بھلائی کا حکم دیتا اور برائیوں سے

روکتا ہے۔ تم نے خدا کے دین کا بیڑا اٹھایا ہے اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں تمہاری جانوں پر امین ٹھہرایا ہے اور دوسری امتوں کیلئے مبلغ اور پیام رساں بنایا ہے"۔

"اے لوگو تم میں حق پرستی کی سنہری مثال' خدائی وعدہ کا مظہر اور وہ تنہا یادگار جسے خدا تعالیٰ نے تمہارے درمیان رکھ چھوڑا ہے خدا کی کتاب اور قرآن پاک ہے۔ یہی وہ درخشاں ستارہ ہے جس کا نور ہمیشہ جھلکتا رہتا ہے' جس کی آیات اور نشانیاں واضح ہیں اور جس کے اسرار پر سے پردہ ہٹا دیا گیا ہے۔ یہی وہ کتاب ہے جس کی پیروی رضوان کے دروازے تک لے جاتی ہے اور جس کا سننا نجات کا باعث بنتا ہے۔

اسی قران سے خدا کے وجود پر ٹھوس دلیلیں ملتی ہیں اور اسی کے ذریعے بندہ خدا کی پسند و ناپسند سے آشنا ہوتا ہے۔

آپ نے اپنا خطبہ جاری رکھا یہاں تک کہ گفتگو فقہی فروعات تک آ پہنچی اور آپ نے فرمایا۔

"باری تعالیٰ نے ایمان کے ذریعے تم لوگوں کو شرک کی غلاظت سے پاک کیا' نماز کے توسط سے تمہیں تکبر سے نجات دی' زکوۃ کو تمہاری جانوں کی پاکیزگی اور روزی میں کشادگی کا سبب بنایا' روزے سے تمہارے خلوص کو استحکام بخشا اور حج سے تمہارے دین کو مضبوط کیا۔۔۔۔"

دینی فروع کو انکی مصلحتوں کے ہمراہ بیان کرنے کے بعد آپ نبوت و رسالت کی بحث میں وارد ہوئیں اور یہاں بھی قرآن مجید سے سخن کا آغاز کیا۔

"ہم نے تم ہی لوگوں میں سے اپنا نمائندہ انتخاب کیا اور اسے رسول بنا کر تمہارے پاس بھیجا' جس کیلئے تمہاری ہلاکت انتہائی سخت اور ناگوار تھی۔ جو تمہاری فلاح و

بہبود پر جان چھڑکتا تھا اور مومنوں کیلئے حد سے زیادہ شفیق اور مہربان تھا"۔

تم لوگ بخوبی جانتے ہو کہ جس رسول کا اس آیہ شریفہ میں ذکر کیا گیا ہے وہ میرے والد گرامی تھے اور میرے شوہر کے بھائی تھے۔ انہوں نے خدا کا پیغام پہنچایا' حق بات کا پرچار کیا' مشرکوں کے دانت کھٹے کئے' بتوں کو چکناچور کیا' شیاطین کو اپنے قابو میں لیا اور پھر تمہیں خدا کی طرف بلایا۔ اور ایک ایسے وقت میں جب تم ہلاکت کے دہانے پر کھڑے ہوئے تھے تمہیں نجات دی۔ پھر جب تم اس سے ڈرنے لگے کہ لوگ تمہیں تاخت و تاراج کریں' خداوند عالم نے میرے اسی پدر بزرگوار کے ذریعے تمہیں ان کے شر سے محفوظ رکھا۔ اور جب سالوں کی محنت و ریاضت کے بعد انہوں نے حق کا جھنڈا گاڑھ دیا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں جایگاہ ابدی میں بلا لیا تو تم میں نفاق پھوٹ پڑا اور دین بوسیدہ ہوتا دکھائی دیا۔ اسی اثناء میں شیطان نے سراٹھایا اور تمہیں آواز دی۔ تم نے اس کی آواز پر لبیک کہا پھر جب اس نے تمہیں کمزور و بے جان پایا تو فریب دیا اور تم دھوکہ کھا گئے۔ جسکا نتیجہ یہ نکلا کہ تم نے ناحق کو حق کہااور نااہل کو اہل کے مقام پر بٹھایا تاکہ رسولؐ اللہ کی وفات کے بعد فتنہ سے بچ سکو لیکن یاد رکھو کہ تمہارا حال انہیں لوگوں جیسا ہے جن کی توصیف میں خدا کی کتاب کہتی ہے کہ'

"یہ لوگ یاد رکھیں کہ فتنہ و فساد انہیں لے ڈوبا ہے اور جہنم کافروں کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے"۔

دختر گرامی رسولؐ نے خطبہ کو اس شدت سے جاری رکھا اور آیات و روایات کی روشنی میں ان پر ثابت کر دیا کہ وہ حق سے منہ موڑے بیٹھے ہیں۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ جتنا اس دن یہ لوگ روئے آنحضرتؐ کی وفات کے بعد کبھی اتنا نہ روئے تھے۔

جناب سیدہ مزید آیات کی تلاوت کرتی ہیں۔

"تم لوگوں نے قرآن مجید سے پیٹھ کر لی ہے اور نہ صرف اس سے بے رغبت ہو گئے ہو بلکہ اس کے بغیر ہی حکم کرنا چاہتے ہو۔ اور ستم گروں کیلئے یہ بہت برا صلہ ہے"۔

"جو لوگ اسلام کے علاوہ کسی اور مسلک پر چلتے ہیں تو ان کی یہ روش ہرگز قابل قبول نہیں اور آخرت میں بھی یہ لوگ خسارے میں ہیں"

"کیا خدا کے حکم کو چھوڑ کر جاہلیت کے قوانین پر عمل کرتے ہو جبکہ ایمان والوں کی نظر میں خدا سے بہتر کون حکم کر سکتا ہے"۔

اس کے بعد آپ حضرت ابوبکرؓ سے یوں ہم کلام ہوئیں۔

"او ابوبکرؓ کیا میں آنحضرتؐ سے حاصل شدہ میراث کو چھوڑ دوں۔ کیا خدا کے قانون میں تم اپنے باپ کے وارث ہو سکتے ہو اور میں اپنے مرحوم باپ کا ورثہ نہیں لے سکتی۔ کتنی غلط بیانی سے کام لیتے ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ جان بوجھ کر خدا کی کتاب کو بھلا رہے ہو اور اسے پس پشت ڈال رہے ہو اس لئے کہ وہ کہتی ہے۔

"سلیمان داؤد کے وارث ہوئے۔"

یہ کتاب حضرت زکریا کی یہ دعا بھی رقم کرتی ہے۔

"خدایا مجھے ایک ایسا فرزند عطا کر جو میرا ولی ہو اور یعقوب و آل یعقوب کی وراثت کا مالک ہو"۔

اسی کتاب میں وراثت کا قانون یوں بھی بیان کیا گیا ہے۔

" اللہ تعالی اولاد کے بارے میں ہمیں وصیت کرتا ہے کہ لڑکی کے مقابلہ میں لڑکے کا حصہ دو برابر ہے"۔

" خدا کے قانون میں کچھ رشتہ دار دوسرے رشتہ داروں پر فوقیت رکھتے ہیں"۔

کیا خدا کے ان احکام کو سن لینے کے بعد بھی اصرار کرتے ہو کہ میرا کوئی حق نہیں۔؟
کیا میں اپنے والد کی میراث اور ان کی یادگار سے محروم رہوں گی۔؟
کیا مجھ میں اور آنحضرتؐ میں کوئی رشتہ نہیں یا وہ تمام قوانین سے مبرا ہیں۔ یا یہ کہ تم میرے والد سے زیادہ خدا کی کتاب کی باریکیوں اور اس کے عموم و خصوص سے واقف ہو۔۔۔۔؟!!

"بہرحال وہ دن دور نہیں جب ستم گروں کا احتساب کیا جائے گا۔ اس دن ندامت سودمند نہ ہوگی اور تم لوگ دیکھو گے کہ کون اس ذلیل و خوار کرنے والے عذاب میں ہمیشہ کیلئے دھکیل دیا جائے گا"۔

حضرت ابوبکرؓ سے فارغ ہو کر آپ نے انصار سے خطاب کیا۔

"اے گروہ انصار میرے والد کی میراث پر قبضہ ہو گیا اور تم خاموش تماشائی بنے بیٹھے رہے۔ حالانکہ حق کی آواز تم تک پہنچ چکی تھی اور قوت و طاقت اور کثرت وعدد میں بھی تم کم نہ تھے۔

تم خدا کے خاص بندے ہو تم نے عرب و عجم کو زیروزبر کیا ہے اور اسلام کا لوہا منوایا۔ میدان جنگ میں تلوار کی کاٹ دکھائی اور شرک و بت پرستی کو مایوس کر کے اسلامی نظام کا سکہ جمایا۔ پس کیا یہ کرنے کے بعد سستی سے کام لیتے ہو اور تلوار نکال کر پیچھے ہٹتے ہو اور شجاعت کے جوہر دکھانے کے بعد بزدلی کے گیت گاتے ہو اور ان لوگوں سے ڈرتے ہو جو وعدہ خلاف ہیں اور تمہارے دین میں رخنہ ڈالتے ہیں۔

"پس کفر کے سرداروں کو مار ڈالو اس لئے کہ ان کا کوئی ایمان نہیں ہے۔ شاید ان لوگوں کا خاتمہ ہو جائے۔"

"البتہ یہ یاد رکھو کہ اگر تم اور روئے زمین پر بسنے والے تمام افراد بھی کافر ہو

جائیں تو خداوند عالم بے نیاز ہی رہے گا۔"

جناب سیدہ کے اس شاندار خطبہ کے بعد جہاں بہت سے انقلاب رونما ہوئے وہاں ایک تبدیلی یہ بھی واقع ہوئی کہ انصار پر پشیمانی اور ندامت حاکم ہو گئی تھی۔ ان میں سے ایک جماعت جناب امیر علیہ السلام کے حق میں آواز بھی اٹھانا چاہتی تھی لیکن امام وقت نے انہیں صبر سے کام لینے کیلئے کہا۔ دوسری طرف جب حضرت ابوبکرؓ کو اپنی کرسی ہلتی دکھائی دی تو انہوں نے سب کو ڈرانا دھمکانا شروع کردیا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ بی بی کے خطبہ نے ایک عظیم تبدیلی کی بنیاد ڈالی۔ اس خطبہ کا محور اسلامی خلافت تھی۔ اگرچہ اس میں کہیں کہیں دوسری چیزوں کی طرف بھی اشارہ کیا گیا تھا۔ اسلامی خلافت کا مطالبہ بھی اس لئے تھا کہ علیؑ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تنہا وارث و جانشین تھے اور صرف وہی حقیقی اسلام کو باقی رکھ سکتے تھے۔ دوسرے حقوق کا مطالبہ کر کے آپ یہ ثابت کر دینا چاہتی تھیں کہ یہ لوگ ناحق اور ظالم ہیں۔ لہٰذا جب آپ خصوصی طور پر مہاجر و انصار کی خواتین سے گفتگو کرتی ہیں تو اس میں فقط خلافت کو مورد بحث قرار دیتی ہیں۔

ان روایتوں کے علاوہ ہمیں کچھ ایسی روایتیں بھی ملتی ہیں جو آپ کی سیرت کے منافی نظر آتی ہیں۔ لیکن اس حقیقت کی روشنی میں کہ دشمنان اہل بیت نے اتنی احادیث گھڑیں کہ ہمارے پاس موجود روایتوں کی ایک بڑی تعداد انہی پر مشتمل ہے' ہم یہی کہیں گے کہ جو باتیں پہلے بیان کی جا چکی ہیں وہ یقینی ہیں اور باقی غیر ثابت شدہ ہیں۔

یہ بھی اپنی جگہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ اس امت نے آپ کا ذرا بھی پاس نہ کیا۔ نہ صرف آپ کی حرمت پامال کی بلکہ آپ کے بارے میں رسولؐ اللہ کی تمام

وصیتوں کو بھی بھلا دیا۔ یہ لوگ مولائے متقیان سے بیعت کے تقاضے بھی کرتے رہے لیکن ہر دفعہ وہ ٹال دیتے۔۔۔ اور ایک دن جب انصار کی ایک جماعت آپ کے گھر موجود تھی حضرت ابوبکرؓ نے کچھ افراد کو حضرت عمرؓ کی سرکردگی میں بھیجا تاکہ اس گھر میں موجود تمام افراد کو گرفتار کر لائیں۔ لہٰذا یہ لوگ وہاں پہنچے اور تمام اہل خانہ کو نکلنے کیلئے کہا۔ جب کامیابی نہیں ہوئی تو گھر کو آگ لگا دی۔

یہی چیز معمولی سے فرق کے ساتھ ہمیں کئی مستند کتابوں میں ملتی ہے۔ (۱)

کچھ روایتوں میں یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ جب حضرت عمرؓ گھر جلانا چاہتے تھے تو کسی نے ان کی توجہ دلائی کہ اس میں بنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں لیکن انہوں نے کوئی توجہ نہ کی۔

کچھ اور روایتوں کے مطابق یہ لوگ زبردستی مولا کو مسجد لے گئے اور بیعت طلب کی اور یہ بھی کہا کہ قبول نہ کرنے کی صورت میں جان بھی جائے گی۔۔۔۔ مولائے متقیان نے فرمایا۔

"کیا خدا کے بندے اور رسولؐ اللہ کے بھائی کو مارنا چاہتے ہو"۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ خدا کا بندہ تو مانتے ہیں لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے۔

ان روایتوں میں مزید ملتا ہے کہ حضرت ابوبکر نے محسوس کیا کہ لوگ علیؑ جیسے شخص کے ساتھ اس رویہ کو ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔ اور وہ بھی اس صورت میں جب جگر گوشہ رسولؐ زاروقطار رو رہی ہوں اور آنحضرتؐ سے فریاد کر رہی ہوں۔ لہٰذا انہوں نے وصی رسولؐ کو آزاد کر دیا۔ رہا ہوتے ہی حضرت امیر علیہ السلام قبر رسول پر پہنچے اور اس ناچارگی اور بے کسی کے عالم میں وہی جملے کہے جو ہارون کی مظلومیت نے ادا کئے تھے۔

---

(۱) تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۱۰۵' ابو الفداء جلد ۲ صفحہ ۶۴ مروج الذہب' المسعودی

"اے خدا کے رسولؐ اس قوم نے مجھے ناتواں کر دیا اور نزدیک تھا کہ جان سے بھی مار ڈالتے۔"

دوسری روایتوں میں یہ بھی مرقوم ہے کہ جب حضرت عمرؓ دوسرے افراد کے ہمراہ امیر المومنین علیہ السلام کو مسجد لیجانا چاہتے تھے تو آپ حائل ہوئیں اور حضرت عمرؓ نے آپ کے چہرے پر سیہ مارا جو آپ کی آنکھ میں آ لگا۔

دوسری روایت کے مطابق اس نے ہنٹر مارا جس سے آپ کا بازو سوجھ گیا۔

تیسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب سیدہؑ اندر کی طرف دروازہ سے پشت کئے کھڑی رہیں تاکہ ان لوگوں کو اندر نہ آنے دیں اور جب انہوں نے زور لگایا تو دروازے سمیت آپ بھی زمین پر آگریں۔ اور وہ بچہ سقط کر گیا جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے محسن کے نام سے یاد کیا تھا۔

کچھ روایتوں میں ہے کہ جب یہ لوگ مولائے متقیان کو زبردستی لے گئے تو آپ بنی ہاشم کی دوسری مستورات کے ہمراہ گھر سے باہر نکلیں اور مسجد پہنچ کر یہ جملے ادا کئے،

"میرے چچا زاد بھائی کو چھوڑ دو ورنہ اس ذات کی قسم کہ جس نے محمدؐ کو برحق مبعوث کیا ہے میں بال بکھیر لوں گی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قمیض کو سر پہ رکھ لوں گی اس لئے کہ خدا کے نزدیک صالح کی اونٹنی مجھ سے زیادہ محترم نہ تھی اور نہ ہی اس کا بچھڑا میرے بچہ سے زیادہ عزیز تھا"۔

کچھ روایتوں میں تو یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ نزدیک تھا جناب سیدہؑ اس قوم پر نفرین کرتیں لیکن حضرت سلمان فارسی نے آپ کو روک لیا۔

یہ اور اس قسم کی کئی روایتیں موثق اور محکم اسناد کی حامل نہیں۔ جہاں تک

نفرین کی روایتوں کا تعلق ہے اس بارے میں ہم یہی کہیں گے کہ آپ اور آپ کے والد گرامی کی یہی سنت رہی ہے کہ اس دنیا میں صبر سے کام لیں اور کمال ضبط کو آزما کر تمام چیزیں دوسری دنیا پر موکول کر دیں۔ لیکن یہ بعید از امکان نہیں کہ اگر آپ نفرین کرتیں تو عذاب آنے میں دیر نہ لگتی۔

جناب سیّدہؑ کی علالت

اس میں شک نہیں کہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت زہراؑ کیلئے مشکلات اور مصائب کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ آنحضرتؐ جیسے شفیق باپ کے سایہ سے محروم ہو جانا' ان کی مسند کا چھن جانا اور فدک اور دوسری وراثتوں سے آپ کا بسکدوش کیا جانا کوئی معمولی غم نہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کا نحیف اور نازنین جسم مزید ہلکان ہو گیا تھا اور آپ بیماری کے بستر پر آلیٹی تھیں۔

آپ کی بیماری کی خبر بڑے زور شور سے مسلمانوں میں پھیلی اور جب حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ اس سے آگاہ ہوئے تو انہوں نے چاہا کہ اپنے کئے دھرے کا مداوا کریں۔ لہٰذا مزاج پرسی اور معذرت کی غرض سے انہوں نے آپ کے گھر کا رخ کیا۔

دروازے پر پہنچ کر جب اجازت چاہی تو آپ نے اجازت نہ دی۔ انہوں نے امیرالمومنین سے رخصت طلب کی۔ حضرت امیرؑ نے آپ کی رضایت دریافت کی اور جب آپ خاموش رہیں تو وہ دونوں اندر آ گئے اور سلام کیا۔ آپ نے جواب نہ دیا اور منہ پھیر لیا۔ انہوں نے آپ سے معذرت طلب کی جس کا اظہار حضرت ابوبکرؓ نے یوں کیا'

"اے ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبوب بیٹی' خدا کی قسم میں آپ کی قرابتداری کو اپنے خونی رشتوں سے زیادہ چاہتا ہوں اور آپ کو عائشہ سے زیادہ پسند کرتا ہوں۔

"اے کاش میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے مرگیا ہوتا اور مجھے وہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔ میں آپ کو آپ کے جائز حق سے محروم نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن کیا کرتا کہ میں نے پیغمبر آخرالزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ کہتے سنا تھا کہ ہم انبیاء کوئی میراث نہیں چھوڑتے۔"

آپ نے اس بارے میں کچھ بولنا مناسب نہ سمجھا اس لئے کہ آپ مسجد نبوی میں کھل کر اپنے نقطہ نظر کو ثابت کر چکی تھیں۔ اور کتاب و سنت کی روشنی میں اپنا لوہا منوا چکی تھیں۔ لہٰذا ان سے اتنا پوچھا کہ کیا تم نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ کہتے نہیں سنا کہ'

"فاطمہؑ کی رضایت میری خوشنودی اور ان کا غصہ میرا غضب ہے جو میری اس بیٹی سے محبت کرتا ہے وہ مجھے چاہتا ہے اور جو ان سے عداوت کرتا ہے وہ مجھ سے دشمنی کرتا ہے۔"

جب حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ نے اقرار کر لیا کہ ہاں ہم نے خود آنحضرتؐ کو یہ کہتے سنا

ہے تو آپ نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دیئے اور فرمایا

"میں اللہ تعالیٰ اور اس کے ملائکہ و انبیاء کو حاضر و ناظر جان کر یہ گواہی دیتی ہوں کہ تم نے مجھ سے دشمنی کی اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملی تو ان کے حضور تم دونوں کی شکایت کروں گی۔"

پھر آپ نے حضرت ابوبکرؓ کی طرف التفات کیا اور فرمایا۔

"جب تک جان میں جان رہی ہر نماز میں تم پر نفرین کروں گی۔" ان جملوں سے دونوں کے دل دہل گئے اور وہ اس گھر کی درودیوار سے بھی ڈرنے لگے تھے اس لئے کہ انہوں نے خود صادق و امین پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے سنا تھا۔

" فاطمہ کا غضب خدائی غضب ہے اور فاطمہ کی خوشنودی باری تعالیٰ کی رضایت ہے۔ (۱)

جب بیماری شدت اختیار کر گئی تو مسلمان عورتیں آپ کی عیادت کیلئے آئیں اور آپ کا حال دریافت کیا۔ آپؑ نے فرمایا۔

"میں اس حال میں ہوں کہ تمہاری دنیا سے متنفر اور تمہاری جدائی پر مسرور ہوں۔ جو کچھ میرے ساتھ ہوا اس کا گلہ خدا تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے حضور کروں گی۔ میری حرمت کا پاس رہا نہ میرے حقوق کی رعایت کی گئی اور نہ ہی اس امت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت کا کوئی خیال رہا"۔

جب مرنے کا وقت نزدیک ہوا تو آپ نے اپنے شوہر کو وصیت کی کہ

"مجھے رات کی تاریکی میں دفن کیا جائے۔ میرے جنازے میں ان میں سے کوئی بھی نہ ہو جس نے مجھ پر ظلم روا رکھا اور میری قبر کا نام و نشان مٹا دیا جائے۔"

---

(۱) یہ مضمون ہمیں " مستدرک حاکم "' اسد الغابہ' میزان الاعتدال' ذخائر عقبیٰ' مقتل خوارزمی اور اہلسنت کی تاریخ و حدیث کی معتبر کتابوں میں بھی ملتا ہے۔

اسی طرح آپ نے انہیں وصیت کی کہ امامہ سے شادی کر لیں تاکہ بچوں کی نگہداشت بہتر طریقہ سے ہو سکے۔

مولائے متقیان نے انہیں اطمینان دلایا کہ ان کی تمام وصیتوں پر عمل کیا جائے گا۔

طبقات ابن سعد میں مرقوم ہے کہ جناب سیدہ پسند نہیں کرتی تھیں کہ عام لوگوں کی طرح سے ان کا جنازہ بھی تخت پر اٹھے اور لوگ آپ کی قدوقامت دیکھیں۔ لہٰذا آپ نے اسماء کو طلب کیا اور اپنی اس خواہش کا اظہار کیا۔ اور جب اسماء نے آپ کیلئے ایک ایسا تابوت بنوا دیا جو چاروں طرف سے چھپا ہوا تھا تو آپ مسکرائیں۔ راوی کہتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد یہ آپ کی پہلی مسکراہٹ تھی۔

اس مختصر سی زندگی کے آخری دن آپ کی حالت کچھ بہتر ہوئی تو بستر سے اٹھیں اور بچوں کو نہلا دھلا کر قبر رسولؐ کی زیارت کیلئے بھیج دیا اور نہانے کیلئے اسماء سے پانی کا انتظام کرنے کو کہا۔ جب پانی فراہم ہو گیا تو آپ نہائیں اور بہترین لباس پہنا۔ اسماء آپ کو اس حالت میں دیکھ کر مطمئن سی ہو گئیں تھیں لیکن ایک دم سے حالت بگڑ گئی اور آپ نے اسماء کو بیچ گھر میں بستر بچھانے کیلئے کہا۔ آپ قبلہ کی طرف رخ کر کے لیٹ گئیں اور پھر اسماء سے کہا اب ہماری رخصت کا وقت آ پہنچا ہے۔

اسماء حیران و پریشان گھر سے باہر نکلیں اور جب پلٹیں تو دیکھتی ہیں کہ ایک پاک و پاکیزہ جسم رکھا ہوا ہے اور آپ اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہیں۔ یہ دیکھنا تھا کہ وہ دھاڑیں مار مار کر روئیں۔ امام حسن و حسین بھاگے بھاگے گھر کی طرف آئے اور پورے گھر میں ایک کہرام مچ گیا۔ لوگ گھر کے گرد جمع ہو گئے تھے اور دھاڑیں مار مار

کر روتے تھے یہاں تک کہ وصی رسول نے سلمان فارسی سے کہا کہ لوگوں کو متفرق کر دیں۔

"اسد الغابہ اور کنز العمال" میں مروی ہے کہ حضرت عائشہؓ اس گھر میں آنا چاہتی تھیں جس میں جناب سیدہ کا جسم اطہر رکھا ہوا تھا۔ لیکن اسماء نے یہ کہہ کر انہیں روک دیا کہ جناب سیدہ نے ہم سے وعدہ لیا تھا کہ کسی کو گھر میں داخل نہ ہونے دیں۔۔

لوگ منتظر تھے کہ آپ کے جنازے میں شرکت کریں لیکن حضرت امیر علیہ السلام نے یوں ظاہر کیا کہ اس کام میں دیر ہے۔ اور جب رات کا ایک بڑا حصہ گزر چکا تو انہوں نے اپنے باوفا اصحاب کے ہمراہ آپ کو بقیع میں دفنا دیا۔ جبکہ بحارالانوار کی روایت کے مطابق انہوں نے آپ کو گھر میں دفنایا۔ اس بارے میں شیخ طوسی بھی انہی دو احتمالات کا تذکرہ کرتے ہیں۔ جب جسم اطہر کو سپرد خاک کر چکے تو غم و اندوہ سے سینہ چھلنی اور حسرتوں سے دل فگار تھا۔ لہٰذا قبر پر توقف کیا اور یہ جملے ادا کئے۔

"اے خدا کے حبیب میرا اور اپنی اس بیٹی کا سلام قبول کیجئے جو آپ کے پاس آرہی ہے اور بہت جلد آپ سے آملی ہے اے خدا کے حبیب اپنی اس بیٹی سے میرے صبر کی انتہا اور میرا کمال ضبط پوچھئے گا۔ آپ کے فراق کی مصیبت کس قدر سخت تھی۔ میں نے جاں بلب ہو کر آپ کو لحد کے حوالہ کیا تھا اور آپ کی امانت بھی آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ میرا غم دائمی اور ہمیشگی کی صورت اختیار کر گیا ہے اور میری راتیں اس وقت تک کیلئے سحر ہو گئیں ہیں جب تک خدا مجھے آپ کے پاس بلالے۔

آپ کی بیٹی خود بتائے گی کہ اس امت نے اس سے کیا سلوک کیا۔ اس سے سوال کیجئے اور حال دریافت کیجئے۔ آپ دونوں پر میرا آخری سلام ہو"۔

حضرت فاطمہ زہراؑ کی شہادت کے وقت میں اختلاف ہے۔۔۔ طبقات ابن سعد میں مرقوم ہے کہ آپ نے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے تین ماہ بعد بیس سال کی عمر میں وفات پائی۔ جبکہ مستدرک حاکم لکھتا ہے کہ آنحضرتؐ کے بعد آپ آٹھ مہینوں تک حیات رہیں۔ اس مسئلہ میں دو مہینہ کی روایت بھی ملتی ہے۔

اب ہم چاہتے ہیں کہ جناب سیدہ کی سیرت کو یہیں پر خاتمہ دیں۔ بے شک آپ نے انسانیت کی تاریخ میں عورت کیلئے تقدس اور پاکیزگی کی سنہری مثال پیش کی۔ اور ظلم و استحصال کے خلاف آواز اٹھانے کا بہترین انداز اپنایا۔ یہ کردار دنیا کی ابتداء سے انتہاء تک منفرد ہی رہے گا۔

امیر المومنین حضرت علیؑ
ابن ابیطالب علیہ السلام

جن کے بارے میں سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"اے علی اگر میں اس سے خائف نہ ہوتا کہ لوگ تمہارے بارے میں وہ کہیں گے جو نصرانیوں نے عیسیٰ ابن مریم کے بارے میں کہا تھا تو اس طرح سے تمہاری تعریف کرتا کہ لوگ تمہارے قدموں کے نیچے کی مٹی اٹھاتے۔"

جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس نفیس گفتار کے بعد میری کیا مجال کہ ان کے بارے میں کچھ کہوں یا لکھوں۔ ان کے بارے میں ہر دور کے مشہور مورخوں اور دانشمندوں نے بے شمار کتابیں لکھیں اور مختلف سوچ اور مزاج کے لوگوں

نے ان کی تعریف و توصیف میں نہ جانے کیا کیا کہا۔ نیز ان کی محبت میں طغیان کرنے والوں نے نصیریوں کی طرح انہیں خدا بنا دیا۔

میں کیونکر ان کے بارے میں کچھ کہہ سکتا ہوں وہ تو خود پہلوانوں اور شہ سواروں کیلئے زندہ مثال ہیں' مخلص مجاہدوں کے ہادی و پیشوا ہیں اور اسلامی علوم' فلسفہ اخلاق' تربیت' قانون گزاری اور اسلامی سیاست کے بانی ہیں۔ وہ مثبت سیاست جو ہر دور کے لوگوں کو انصاف و عدالت اور امن و سعادت دیتی ہے۔ اور آخرت کی نعمتوں سے بہرہ مند کرتی ہے۔

اپنے اس اعتراف اور اقرار کے بعد بھی میں کوشش کروں گا کہ ان کی سیرت کے کچھ جوانب پر قلم اٹھاؤں۔ اس سلسلے میں میں بارگاہ ربوبی سے توفیق و مدد کا طالب ہوں۔

بے شک امیر المومنین علیہ السلام کی زندگی انسانیت کی تاریخ کا ایک عظیم معجزہ ہے جو ولادت سے لیکر آخری سانسوں تک عام طبیعت و عادات سے بہت مختلف تھی۔ انہوں نے دنیا میں آنکھیں کھولیں تو اپنے کو خانہ کعبہ میں پایا۔ تاریخ ولادت کے واقعات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہے کہ ان کی والدہ قریش کی معزز خاتون' طواف کی غرض سے آئیں تھیں کہ ناگہان شدید درد اٹھا۔ ابھی ہاتھ دعا کیلئے اٹھائے ہی تھے کہ خانہ کعبہ کی دیوار شق ہوئی اور آپ اندر چلی گئیں۔ یہ ولادت ایک ایسا اعزاز ہے جو نہ آپ سے پہلے کسی کو نصیب ہو اور نہ ہی آپ کے بعد۔ جیسے خدا کے گھر سے آئے تھے ویسے ہی جب رخت سفر باندھا تو خدا کا گھر تھا۔ "ہاشمی الطرفین" ہونا انہی کی ذات سے منسوب ہوا حالانکہ اس گھر میں آپ سے پہلے حضرت طالب و جعفر و عقیل تشریف لا چکے تھے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ جب حضرت فاطمہ بنت اسد نبی اکرم کی ولادت کی خوشخبری لے کر حضرت ابو طالب کی خدمت میں آئیں تو انہوں نے کہا کہ آپ تیس سال ٹھہر جائیں تو میں آپ کو بھی ہو بہو ایسے فرزند کی نوید دوں گا جس میں نبوت کے سوا تمام خوبیاں ہوں گی۔(۱)

آپ کی والدہ ماجدہ بیان کرتی ہیں کہ ولادت کے بعد تین دن تک آپ نے ان کا دودھ نہیں چھوا۔ اس دوران آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک چوستے رہتے تھے یہاں تک کہ سیراب ہو جاتے۔

ہم اس روایت سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا تھا کہ آپ کو رسول امینؐ کی آغوش میں ایک ایسی تربیت ملے کہ آپ آنحضرتؐ کی زندگی اور زندگی کے بعد کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھا سکیں۔ پس پہلی چیز جو آپ کے بدن میں داخل ہوئی وہ کوئی ایسی معمولی چیز نہ تھی جس سے شیرخوار بچے مانوس ہوں بلکہ وہ خدا کے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مبارک زبان تھی جو شروع سے حق و صداقت پر پروان چڑھی تھی یہاں تک کہ آنحضرتؐ جوان ہو گئے اور سچائی اور امانتداری ان میں اس طرح سے رسوخ کر گئی کہ لوگ حسب و نسب سے زیادہ آپ کو ان دو خوبیوں سے پہچاننے لگے۔

آنحضرتؐ چاہتے تھے کہ جس طرح سے خدا نے آپ دونوں کے دلوں کو یکجا کر دیا ہے اسی طرح زبانیں بھی یکساں ہو جائیں۔ اسی لئے پہلے دن سے انہوں نے آپ کے منہ میں وہ زبان دیدی جو صداقت و حکمت کے بغیر نہیں ہلتی تھی۔ تاکہ آپ کی زبان پر بھی حکمت و دانائی کو نقش کردیں، سچائی و صداقت کو آپ کی گھٹی میں پلادیں اور کفر و الحاد سے جنگ کو آپ کی سرشت میں سمو دیں۔ پھر کہیں جاکر دودھ پینے کی نوبت

---

(۱) الکافی جلد ۱ صفحہ ۴۵۲ محمد ابن عبداللہ سکان کی روایت، کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ اور جناب امیرؑ کی ولادت میں بھی تیس سال کا فرق ہے۔

آئی۔ آپ کو اس ماں کے دودھ پینے کا شرف حاصل ہوا جس نے یتیمی کے زمانہ میں آنحضرتؐ کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھا۔ اور اپنی تمام اولاد پر انہیں اتنی فوقیت دی کہ شاید وہ اپنی والدہ ماجدہ سے بھی اس کی توقع نہ کرتے۔

حضرت امیر علیہ السلام آٹھ سال تک اپنی والدہ کی زیر نگرانی رہے پھر آنحضرتؐ نے آپ کو زیر تربیت لے لیا۔ وہ آپ کو بہت زیادہ توجہ دیتے۔ ہروقت اپنے ساتھ رکھتے' آداب و اطوار سکھاتے' اچھی چیزوں کی تعلیم دیتے اور جہان ہستی اور خالق کی معرفت سے متعلق حقائق سے آشنا کرتے۔ اسی لئے آپ نے کائنات کے اسرار و رموز کو اس طرح سمجھا کہ آپ کے علاوہ رسولؐ اللہ کے بعد کوئی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

آپ کی تمام خوبیوں میں آنحضرتؐ کی صفات جھلکتی تھیں۔ نیز جاہلیت کے دور کی برائیوں سے جس طرح آنحضرتؐ نے دامن بچایا اسی طرح آپ بھی ان سے محفوظ رہے۔ اور اپنی صفات و کردار میں ایک اعلیٰ مثال بن گئے۔

آپ خود فرماتے ہیں کہ میں نے سات سال کی عمر میں خدا کی پرستش کی اس سے پہلے کہ اس امت کا کوئی شخص خدا کی عبادت کرتا۔ آپ کے دوست و دشمن دل سے اعتراف کرتے ہیں کہ علم و تقویٰ' شجاعت و قضاوت اور زہد و پرہیزگاری میں ان کا کوئی جواب نہ تھا۔ اسی طرح عقل و ادراک' فہم و فراست' صبر و ضبط' رزم و جزم کے معرکوں اور مظلوم کو اس کا حق دلانے میں بھی ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔

جیساکہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ مولائے متقیان بچپن ہی سے حضوراکرمؐ کے زیر تربیت آ گئے تھے۔ آپ نے آغوش رسالت میں پرورش پائی یہاں تک کہ جوانی کی حدود میں داخل ہونے لگے۔ اور اس وقت جب آپ کی عمر تیرہ برس کی ہوئی

آنحضرتؐ رسالت پر مبعوث ہو چکے تھے۔ انہوں نے جب آپ کو اس دین کی دعوت دی تو آپ نے کھلے دل سے اس کا استقبال کیا اور اسلام کے تمام احکام و تعلیمات پر اپنے ایمان کا اظہار کر دیا۔

دن ہو یا رات آپ ہمیشہ آنحضرتؐ کے ساتھ ہوتے اور ان کے تمام رازوں سے باخبر رہتے۔ سوائے ان خاص چیزوں کے جو نبوت کے مقام سے مخصوص ہوتی ہیں آپ تمام آسمانی خبروں کو بھی سن سکتے تھے۔

اگر ہم یہ کہیں کہ اسلام کی روح آپ کی ذات و صفات میں نمایاں ہوتی ہے تو بیجا نہ ہوگا اس لئے کہ آپ ایک ایسے دور میں پلے بڑھے تھے جہاں سے اسلام کی دعوت کا آغاز ہوا۔ پھر بچپن سے لے کر اس دعوت کے آغاز تک اسلام کے پیغمبر سے آپ کا اتنا گہرا لگاؤ اور اتنا زبردست روحی اور فکری تعلق رہا جو رشتوں کی بنیاد پر استوار نہیں ہوا کرتا۔ مورخین و محدثین کے علاوہ آپ کے سرسخت دشمن بھی مانتے ہیں کہ اس نئے دین کیلئے آپ سے زیادہ مخلص اور جاں نثار شخص نہ تھا جس نے اپنی تمام توانائیوں کو اس کیلئے وقف کر دیا تھا۔

آپ قرآن کی تعلیمات اور حضورؐ اکرم کی سیرت اور ان کے اعلیٰ اخلاق کو اپنی گفتار و کردار اور تمام کاموں میں اس طرح سے مجسم کر گئے جو تمام مسلمانوں کیلئے ایک سنہری مثال ہے۔

اس لئے کسی نے کہا ہے کہ میں اس شخصیت کے بارے میں کیا کہوں کہ جس کے دوست ڈر کے مارے اس کے فضائل سے چشم پوشی کرتے تھے اور جس کے دشمن حسد و کینہ کی وجہ سے اس کی خوبیوں کو چھپائے رکھتے تھے پھر بھی ان کے اتنے کمالات سامنے آئے جنہوں نے مشرق و مغرب کو ہلا کر رکھ دیا۔

اپنے پرائے سب ہی ان کے گرویدہ تھے۔ ہر شخص نے اپنی سوچ اور اپنے نظریات کے مطابق ان کی تعریف کی۔ کچھ لوگ تو ان کی محبت و دیوانگی میں اتنے بڑھے کہ نعوذباللہ انھیں خدا کہا۔ اور خدا کے بجائے ان کی عبادت اپنا لی۔ یقیناً یہ لوگ دوزخ کی آگ میں جل رہے ہوں گے۔ بنی امیہ اور خوارج ان سے بدزبانی کرتے تھے۔ لیکن یہ لوگ صرف جنگ صفین میں اس وقت جب قرآن نیزوں پر اٹھایا جا چکا تھا صرف حکم کرنے میں غلطی کو ان سے نسبت دے سکے۔

سلام ہو اس پاک رسولؐ پر جنھوں نے بہت پہلے ہی مولا کو ان چیزوں سے آگاہ کر دیا تھا اور فرمایا تھا۔

" اے علی تمہاری ذات میں دو شخص ہلاک ہو گئے وہ عاشق و محب جس نے تمہاری محبت میں طغیان کیا اور وہ جس نے تم سے کینہ و بغض رکھا اور اول فول بکتا رہا"۔

عقاد جیسا دانشمند لکھتا ہے کہ میں نے کسی شخص کے بارے میں اتنا اختلاف نہیں دیکھا کہ کچھ لوگ تو اسے خدا کہہ رہے ہوں اور کچھ کافر و ملعون سمجھ رہے ہوں۔"

علیؑ اور دعوت اسلام

جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چالیس سال کی عمر میں رسالت پر مبعوث ہوئے تھے۔ تمام مورخین اور محدثین اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت خدیجہ علیہا السلام وہ پہلی شخصیت تھیں جنہوں نے اسلام کا اظہار کیا۔ تاریخ ابن خلدون اور تاریخ یعقوبی اس بارے میں یہ بھی رقم کرتی ہیں کہ جب نماز کا حکم آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ پہلی نماز ادا کرنے کا شرف حضرت خدیجہ کو نصیب ہوا۔

مورخین اس میں بھی کوئی شک نہیں رکھتے کہ امیرالمومنین حضرت علی ابن ابی طالب مردوں میں سب سے پہلے اپنے اسلام کا اظہار کر چکے تھے اور آپ کے بعد اسلام لوگوں میں پھیلنا شروع ہوا۔ اختلاف اس پر ہے کہ اسلام کے اس اعلان کے

وقت آپ کی عمر کیا تھی۔؟

اس بارے میں ہماری نظر میں مناسب ترین مقولہ یہ ہے کہ اس وقت آپ کی عمر پندرہ برس کی تھی۔ حسن بصری اس مقولہ کو روایت کرتے ہیں اور مورخین کی ایک جماعت اسے پسند کرتی ہے۔

البتہ کتاب "الکافی" میں محمد یعقوب کلینی روایت کرتے ہیں کہ اسلام لاتے وقت آپ کی عمر دس سے تیرہ سال کے لگ بھگ تھی۔۔۔۔ جبکہ حذیفہ ابن یمان اور ابن ابی شیبہ کی روایتوں کے مطابق آپ چودہ سال کے تھے۔

اہلسنت کے ایک دانشمند جاحظ آپ کی عمر کو سات سال بتاتے ہیں۔ وہ اس مقولہ میں اس اختلاف پر تکیہ کرتے ہیں جو آپ کی عمر کے بارے میں ان روایتوں میں موجود ہے۔

حالانکہ جتنی روایتیں بھی مولا کے اسلام کے بارے میں ملتی ہیں ان میں آپ کی عمر کے بارے میں کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ مزید یہ کہ جاحظ کے علاوہ کوئی بھی اس نظریہ کا حامی نہیں اور خود محدثین کی ایک جماعت ان کے اس نقطہ نظر کو جہالت پر مبنی ٹھہرا کر غیر حقیقی قرار دیتی ہے۔ انہی افراد میں ابو جعفر اسکافی بھی ہیں جو ان کی تردید میں لکھتے ہیں۔(۱)

"چھوٹے بڑے پڑھے لکھے اور بے پڑھے سب ہی جانتے ہیں کہ علیؑ اس گھر میں پیدا نہیں ہوئے جہاں سے اسلام کی دعوت کا آغاز ہوا بلکہ وہ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر میں آئے جب ان کی عمر آٹھ برس کی تھی اور مکہ میں قحط و خشک سالی تھی۔ وہ سات سال تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں رہے اور اس پورے عرصہ میں نبوت کی خبر بھی نہ ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ

---

(۱) شرح نہج البلاغہ صفحہ ۲۶۵ ۔ ۲۶۴ جلد ۳

وسلم اس دوران دین ابراہیمی پر عمل پیرا تھے اور حضرت علیؑ بھی ان کی پیروی کرتے تھے۔۔ جب اسلام کی دعوت کا آغاز ہوا تو وہ عاقل و بالغ ہو چکے تھے۔ لہٰذا جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کو اسلام کی دعوت دی تو آپ نے فہم و فراست اور عقل و شعور کی روشنی میں اسے لبیک کہا۔"

اسکافی کی اس دلیل سے ثابت ہو جاتا ہے کہ حضرت امیر علیہ السلام اسلام کے اظہار کے وقت عاقل و بالغ تھے۔ لیکن جاحظ جیسے متعصب لوگ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت علیؑ بچوں کی مانند بڑوں کے کہنے پر اسلام لائے تھے اور حضرت ابوبکرؓ جو مرد تھے پوری عقل و دانش کے ساتھ اسلام کی طرف بڑھے تھے۔

اس قسم کی کوششیں اہل بیت کے دشمنوں کی طرف سے ہوتی رہی ہیں اس لئے کہ جب وہ مولا علیؑ کی اس مثالی زندگی میں ایک عیب بھی نکالنے سے عاجز آ گئے تو ناچار انہوں نے اس قسم کی کوششیں شروع کر دیں۔

بالفرض اگر مان لیا جائے کہ اس وقت آپ کی عمر سات سال تھی تب بھی تاریخ یہی رقم کرتی ہے کہ دعوت اسلام کے تمام مرحلوں میں آپ سے بڑھ کر کوئی اسلام کا حامی و مددگار اور اسلام کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فدائی اور خیرخواہ نہ تھا۔ اس بارے میں تفصیل سے "سیرۃ المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" میں بحث کی جا چکی ہے۔

اہلسنت کی معتبر کتابیں، سنن ابن ماجہ، مسند احمد، سنن نسائی، کنز العمال، مروج مسعودی اور مجمع الزوائد یہ تو نہیں لکھتیں کہ اسلام پر لبیک کہتے وقت آپ کی عمر سات برس کی تھی لیکن ان میں یہ اشارے ضرور ملتے ہیں کہ اس وقت آپ عہد طفولیت میں تھے۔ لیکن اسکافی ان سب باتوں کی تردید کر کے یہ ادعاء کرتے ہیں کہ

اس وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا شمار مردوں میں ہوتا تھا۔ وہ اپنے اس ادعاء کو دعوت ذوالعشیرہ جیسے مشہور تاریخی واقعہ سے ثابت کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ نے اسلام کا پیغام پہنچنے کے کچھ ہی دنوں بعد نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا کہ وہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو اسلام کی دعوت دیں۔ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سب لوگوں کو دعوت دی۔ جب سب جمع ہو گئے اور کھانا تناول فرمایا جا چکا تو خدا کے حبیب نے خدا کی وحدانیت کا درس دیا اور اسلام کا پیغام ان لوگوں تک پہنچایا اور پھر فرمایا

"تم میں سے جو کوئی بھی اس کام میں میری مدد کرے گا وہ میرا بھائی' وصی اور میرے بعد میرا جانشین ہوگا"۔

تاریخ لکھتی ہے کہ سوائے علیؑ کے کسی نے مثبت جواب نہیں دیا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تیسری دفعہ بھی اس جملے کو دہرا چکے اور کسی نے جواب نہیں دیا تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا۔

"تم میرے بھائی' وصی اور وارث ہو اور میرے بعد میرے جانشین ہو"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ بات سن کر وہ لوگ ہنستے مذاق اڑاتے اٹھ بیٹھے اور محفل برخاست ہو گئی۔"

اسکافی رقم کرتے ہیں کہ کیا کھانا دینے کا انتظام و اہتمام سات سال کے کمسن بچہ کے سپرد کیا جا سکتا ہے۔؟ کیا اتنی عمر کے بچہ میں یہ استعداد ہوتی ہے کہ بڑوں بوڑھوں کو دعوت دے۔؟

اور پھر کیسے ممکن ہے کہ سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رسالت کا

بوجھ ایک ایسے بچہ پر لادھدیں جو پختہ عمری تک نہ پہنچا ہو۔ لہٰذا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں دیدیا اور آپ کو اپنا خلیفہ بنا لیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ اس کی اہلیت رکھتے تھے اور اس سے متعلق تمام چیزوں کی ذمہ داری کو محسوس کرتے تھے۔

خود امیر المومنین علیہ الصلوۃ والسلام اپنے اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنی قرابتداری کا اظہار یوں فرماتے ہیں۔(۱)

"تم لوگ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے میری رشتہ داری اور ان کی نظر میں جو مقام و منزلت میرے لئے تھا' اس سے بخوبی واقف ہو۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں رکھتے اور جبکہ میں بچہ تھا مجھے اپنے سینہ سے چمٹاتے اور اپنے بستر پر سلاتے۔ وہ اپنا جسم مجھ سے مس کرتے تھے جس کی خوشبو سونگھ کر میں عجیب فرحت کا احساس کرتا تھا۔ پہلے لقمہ چباتے اور پھر میرے منہ میں ڈالتے۔ انہوں نے میری رفتار میں جھوٹ پایا نہ میرے کردار میں خطا دیکھی۔ جس اعلیٰ اخلاق سے بارگاہ ربوبی سے انہیں نوازا گیا تھا اس میں میں یوں ان کی پیروی کرتا تھا جیسے اونٹنی کا بچہ اپنی ماں کے پیچھے چلتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر روز اپنے بلند اخلاق میں سے ایک خلق سکھا کر میرے علم میں اضافہ کرتے اور مجھے اس پر پابند رہنے کی تاکید کرتے۔

اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت خدیجہ اور میرے علاوہ کوئی اسلام کا ماننے والا نہ تھا۔ میں نے وحی و رسالت کے نور کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور نبوت کی خوشبو سونگھی۔ میرے کانوں میں کسی کے رونے کی آواز سنائی دی تب میں نے پوچھا یارسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ کس کے رونے کی آواز ہے۔ انہوں

---

(۱) اسے شرح نہج البلاغہ سے نقل کیا گیا ہے۔

نے جواب دیا یہ شیطان کی آواز ہے جو خدا کے بندوں سے مایوس ہو کر رو رہا ہے۔
پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت امیرؑ کی شان میں یہ جملے کہے۔

"تم ہر اس چیز کو سن رہے ہو جو میں سن رہا ہوں اور وہ کچھ دیکھ رہے ہو جو میں دیکھ رہا ہوں سوائے اس کے کہ تم نبی نہیں ہو بلکہ وزیر (وصی) ہو اور اچھائی پر گامزن و استوار ہو۔"

علامہ مجلسی "بحارالانوار" میں علی ابن ابراہیم سے روایت کرتے ہیں کہ مولائے متقیان کے بعد جعفر ابن ابو طالب ایمان لائے پھر زید ابن حارثہ اور پھر حضرت ابوبکرؓ اگرچہ ابن ابی الحدید معتزلی بھی اس نظریہ کی تائید کرتے ہیں لیکن کچھ روایتوں میں حضرت امیر علیہ السلام کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے اسلام کا تذکرہ ملتا ہے جبکہ کچھ اور روایتوں میں حضرت امیرؑ کے بعد زید ابن حارثہ کے اسلام کو بتایا گیا ہے۔

البتہ زیادہ تر روایتیں اس بات کی تصدیق کرتی ہیں کہ حضرت جعفر و زید کا اسلام حضرت ابوبکرؓ کے اسلام سے پہلے تھا۔

دوسری طرف سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کچھ ایسے مصنفین بھی نظر آتے ہیں جو رقم کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے نہ صرف اسلام لانے میں سبقت کی تھی بلکہ وہ اسلام کے داعی بھی بن گئے تھے اور ان کے زیر اثر حضرت عثمان، زبیر، طلحہ اور سعد ابن ابی وقاص اسلام لے آئے تھے۔ یہ تمام لوگ اس رائے کو اختیار کرنے میں حضرت ابوبکرؓ کی صاحب زادی اسماء کی روایت پر تکیہ کرتے ہیں۔

مورخین اور محققین حضرت ابوبکرؓ کے اسلام پر تجزیہ کرتے ہوئے اس بات کی تردید کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت ابوبکرؓ ان لوگوں پر اثر انداز ہوں جبکہ ان میں سے کوئی بھی ان کے حلقہ احباب میں نہیں تھا۔ پھر جب وہ اپنے

والد' اپنے بیٹے عبدالرحمٰن اور بہو حملہ کو اسلام کی طرف مائل نہ کر سکے تو کیونکر ان لوگوں کو مسلمان کرتے۔

مزید یہ کہ اسماء جو اس روایت کی واحد سند ہیں' اس وقت زیادہ سے زیادہ چار سال کی تھیں اور تین یا چار سال کی بچی میں اتنا شعور نہیں ہوتا کہ وہ ان تمام مسائل کو سمجھ سکے۔

ان نکات کی روشنی میں یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ روایات معتبر نہیں ہیں لہٰذا یہ مقولہ باطل ہو جاتا ہے۔

علیؑ شعب ابو طالب میں

قریش آنحضرات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اصحاب پر تمام حربے آزما کر اور ظلم و استحصال کی انتہاء کر کے، ہمت ہار بیٹھے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ نہ صرف ان کوششوں کا کوئی فائدہ نہیں نکلا بلکہ الٹا نقصان بھی ہوا ہے۔ انہوں نے اس بات کا بھی بخوبی جائزہ لے لیا تھا کہ جب تک علیؑ اور حمزہ مسلمانوں کے درمیان موجود ہیں وہ اس تحریک کو ختم نہیں کر سکیں گے۔

بلکہ اب تو اس تحریک کی قدرت روزبروز بڑھتی چلی جارہی تھی اور کوئی ایسا گھر نہیں تھا جہاں اس نئے دین کا ماننے والا نہ ہو۔ مکہ ہی پر کیا منحصر یہ آواز حبشہ تک پہنچ گئی تھی جہاں کے بادشاہ نے اس پر کوئی پابندی عائد نہیں کی تھی۔ نیز آس پاس کے علاقوں میں بھی کم و بیش اس کے اثرات پہنچ گئے تھے۔

اس بڑھتے ہوتے خطرے کے پیش نظر قریش، بنی مخزوم اور مکہ کے دوسرے قبیلوں نے بنی ہاشم کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے آپس میں طے کیا کہ بنی ہاشم سے لین دین، شادی بیاہ اور اس قسم کے دوسرے معاملات پر پابندی لگا دی جائے۔ انہوں نے اس قرارداد کو منظور کر کے تحریری صورت میں خانہ کعبہ کی دیوار پر آویزاں کر دیا۔ اور یوں جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اور بنی ہاشم کو شہر سے دور ایک تنگ اور بے آب و گیاہ گھاٹی میں محصور ہونا پڑا۔ جسے تاریخ شعب ابو طالب کے نام سے یاد کرتی ہے۔ اس ناکہ بندی کی مدت دو سال اور کچھ تاریخوں کے مطابق تین سال تھی۔ کچھ ہی مہینہ بعد بنی ہاشم کا آذوقہ اور کھانے پینے کا سامان ختم ہو گیا اور بھوک و فاقہ کی شدت سے اکثر بچوں اور عورتوں کی چیخ و پکار سنائی دیتی۔ ادھر قریش بازار کی چیزیں مہنگے داموں خرید لیا کرتے تاکہ کہیں یہ بنی ہاشم تک نہ پہنچ جائیں۔ رات کی تاریکی میں کبھی کبھار اگر کوئی چیز پہنچتی تو وہ اس خاندان اور قبیلہ کے تمام لوگوں کیلئے اتنی کم ہوتی جس سے بھوک کی تیزی میں کمی نہ آتی لہٰذا مجبوراً یہ لوگ گھاس پھوس اور پتے کھا کر زندگی گزار رہے تھے۔

اہلسنت کے مشہور مورخ ابن کثیر اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں۔

"یوں نظر آتا ہے کہ ابو طالب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو باقی رکھنے اور انہیں زندہ دیکھنے کے حددرجہ مشتاق تھے۔ وہ رات کی تاریکیوں میں بستر بدل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے کسی بھی فرزند کی جگہ سلا دیا کرتے اور اپنے فرزند کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جگہ پر تاکہ اگر کبھی دشمن حملہ کرے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آسیب نہ پہنچے۔

شرح نہج البلاغہ میں ابی جعفر محمد ابن حبیب کی امالی سے ایک روایت نقل ہوتی

ہے جس کے مطابق حضرت ابو طالب اکثر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھ کر فرط محبت سے رو پڑتے تھے اور اپنے بھائی عبداللہ کو یاد کرتے۔ اس روایت میں یہ بھی ملتا ہے کہ وہ اکثر امیر المومنینؑ کو ان کے بستر پر سلا دیتے اور جناب امیر علیہ السلام خدا کی خوشنودی کی خاطر اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کی نصرت میں بڑے شوق سے سوجایا کرتے۔ اس روایت میں آپ دونوں کے اشعار بھی نقل کئے جاتے ہیں جو اس جذبہ کی عکاسی کرتے ہیں جو آپ دونوں اس دین اور اس دین کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں رکھتے تھے۔

علیؑ ہجرت کی رات میں

حضرت ابو طالب کی وفات کے بعد قریش جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حد سے زیادہ جری ہو گئے تھے۔ وہ آپ کی عزت کرتے نہ احترام برقرار رکھتے۔ مکہ میں کوئی بھی نہ تھا جو آپ کو امان دیتا اور کفار کے شر سے محفوظ رکھتا۔ جب آپ پہلی مرتبہ حضرت امیرؑ اور زید ابن حارثہ کے ساتھ اس دین کی تبلیغ کیلئے نکلے اور سرزمین طائف پر قدم رکھا تو یہاں کے لوگوں نے نہ صرف آپ کی دعوت کو قبول نہیں کیا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے اوباش قسم کے لڑکے بھی لگا دیئے۔ انہوں نے آپ کو لہولہان کر دیا۔ اس موقع پر امیر المومنین علیہ السلام تمام پتھروں کو اپنے سینہ پر روکتے ہوئے زخمی ہو گئے تھے لیکن پھر بھی کچھ پتھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ٹانگوں پر لگے جس سے خون بہنے لگا۔

طائف سے واپس آکر جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہت مشکل سے مطعم ابن عدی کی امان میں مکہ میں داخل ہو سکے۔ یہاں پہنچ کر آپ اللہ تعالیٰ کے حکم اور مدینہ کے وفود کا انتظار کرنے لگے۔

قریش اور خصوصاً ابو لہب آپ پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ ہجرت کرنے میں کامیاب ہو گئے اور اگر مدینہ اسلام کی نشر و اشاعت کا مرکز بن گیا تو پھر اسلام پورے جزیرہ عرب کیلئے خطرہ بن جائے گا۔ دوسری طرف ان میں سے کسی میں بھی اتنی جرات نہ تھی کہ بنی ہاشم کے اس چشم و چراغ کو بجھا دے اور اپنے یا اپنے قبیلے کے ہاتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خون سے رنگین کرلے۔ لہٰذا انہوں نے اس مسئلہ پر غور فکر کرنے کیلئے "دارالندوہ" نامی جگہ پر ایک جلسہ منعقد کیا۔

مورخین لکھتے ہیں کہ اس جلسہ میں ہر قبیلے کے سردار اور بزرگ نے اپنی اپنی تجاویز پیش کیں لیکن آخری فیصلہ ابو جہل ابن ہشام نے کیا۔ طے یہ پایا کہ رات کی تاریکی میں تمام قبیلوں سے منتخب شدہ افراد کا ایک گروہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر بھیجا جائے جو آپؐ کا کام تمام کردے۔ اس گروہ نے آتے ہی آپؐ کے گھر کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور رات کے مزید تاریک ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

ادھر اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے وحی نازل کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قریش کے ناپاک عزائم سے آگاہ کیا اور ہجرت کا حکم دے کر قریش کا یہ منصوبہ خاک میں ملا دیا۔ جب سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مولائے متقیان کو اس واقعہ کی خبر دی تو فرط محبت سے ان کی آنکھیں آزدہ ہوئیں اور وہ رونے لگے۔ لیکن جب خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں اپنے بستر پر سونے کیلئے

کہا تو انہوں نے پوچھا'

"یارسولؐ اللہ کیا اگر میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کروں تو آپ بچ جائیں گے"۔۔۔؟

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کیوں نہیں میرے خدا نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔ یہ سن کر امیرالمومنین علیہ السلام نے ہنسی خوشی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چادر اوڑھی اور خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انداز سے لیٹ کر اطمینان و یقین کی گہری نیند سو گئے۔

ہمارے سامنے بڑے بڑے پہلوانوں کے معرکتہ الآرا قصے اور واقعات ہیں جنہوں نے ہتھیار و اوزار کے بہترین استعمال سے طاقتور دشمن کو شکست دی۔ لیکن کسی ایسے دلاور اور شجاع کا تذکرہ نہیں سنا جو خالی ہاتھ موت کو گلے لگا لے اور اسے تھوڑی بہت پریشانی بھی نہ ہو۔

روایات کے مطابق قریش کے یہ پٹھو رات کو گھر کی دہلیز سے جھانک کر دیکھتے رہتے تھے اور ہر دفعہ انہیں یہ اطمینان ہو جاتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابھی سو رہے ہیں۔ جب رات کی ایک تہائی گزر گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو گھر میں کہیں چھپ گئے تھے' باہر نکلے اور انہوں نے جنوب کی سمت میں غار ثور کی طرف بڑھنا شروع کیا۔

سیرت ابن ہشام' تاریخ طبری اور طبقات ابن سعد میں مرقوم ہے کہ گھر سے باہر نکلتے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ جاتے وقت آپؐ نے زمین سے اپنی مٹھی میں مٹی بھری اور ان سروں پر پھینکنے لگے اور اس آیہ شریفہ کی تلاوت کرنے لگے۔

"اور ہم نے ان کے درمیان اور ان کے پیچھے ایک دیوار کھڑی کر دی ہے اور انہیں مدہوش کر دیا ہے پس وہ نہیں دیکھ سکتے"۔

جب رات کا اچھا خاصا حصہ گزر چکا تو ان سب نے آنحضرتؐ کے بستر پر دھاوا بول دیا لیکن علی ابن ابی طالبؑ کو دیکھ کر ان کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔

کچھ روایتوں کے مطابق انہوں نے دور سے پتھر پھینکے لیکن جب سونے والے نے حرکت نہ کی تو انہوں نے بستر پر حملہ کر دیا۔ امیر المومنین علیہ السلام بھی خالی ہاتھ ان لوگوں کے مقابلہ کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے جن کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں تھیں۔ ان میں خالد ابن ولید پیش پیش تھے۔ تھوڑی سی دیر میں آپ نے خالد سے تلوار چھینی اور سب کو بھگا دیا۔

تاریخ یعقوبی میں مرقوم ہے کہ اسی رات خداوند عالم نے اپنے دو مقرب ملائکہ کو وحی کی کہ میں نے تم دونوں کے درمیان برادری اور اخوت برقرار کی ہے اور تم میں سے ایک کی عمر کو زیادہ قرار دیا ہے۔ پس تم میں سے کون اس طویل زندگی کو دوسرے کو پیش کرنا پسند کرے گا۔؟

جب دونوں میں سے کوئی بھی اس قربانی کیلئے حاضر نہ ہوا اور دونوں نے اپنے لئے حیات کو پسند کیا تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تم کیوں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور علیؑ مرتضیٰ کی طرح نہیں ہو کہ میں نے ان کے درمیان بھی اخوت برقرار کی تھی اور ان میں سے ایک کو زیادہ زندگی دی تھی لیکن علیؑ نے بستر پر سو کر اپنی جان ہمارے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قربان کر دی۔ تم دونوں زمین کی طرف جاؤ اور انہیں دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھو۔ دونوں زمیں پر اترے اور فرمان الٰہی کی اطاعت کی۔

ان میں حضرت جبریل یہ فرما رہے تھے۔

"اے علیؑ آپ جیسے لوگ کتنے سعادت مند ہیں کہ خدا سات آسمان کے اوپر سے بیٹھا آپ پر فخر و افتخار کر رہا ہے۔"

بہرحال حضرت امیر علیہ السلام کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر پر سونا اگرچہ ایک بے لوث ایثار ہے لیکن آپ کی اور آپ کے والد کی پوری زندگی اس قسم کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ حضرت ابو طالب نے آخری سانس تک جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت کی وہ بے مثال ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاطر ہی انہوں نے کئی سال تنگ گھاٹی میں گزارے اور فقر و فاقہ کو برداشت کیا۔ یہاں وہ راتوں کو بستر بدل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے کسی بچہ کی جگہ سلا دیتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اطمینان دلانے کیلئے یہ کہتے۔

"خدا کی قسم جب تک وہ ہمیں زمین میں دفن نہ کر دیں تب تک تمہارا بال بھی بیکا نہ کر سکیں گے۔"

لیکن اس جذبہ کی تاریخ نے یہ قدردانی کی کہ ان کی وفات کو شرک کی موت بتایا۔ شاید ان لوگوں کی نظر میں حضرت ابو طالب کی کوئی غلطی نہ تھی سوائے اس کے کہ وہ مولائے متقیان کے والد تھے۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ سب لوگ ان کی قدامت و پاکیزگی کے گیت گاتے۔۔۔ خود امیر المومنین علیہ السلام کا سرور کائنات کی چادر اوڑھ کر خاص ان کے انداز سے انہی کے بستر پر سونا حکمت سے خالی نہ تھا لیکن غیر تو غیر خود علیؑ کا کلمہ پڑھنے والے اور ان کے شیعہ بھی اس واقعہ کو بصیرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔

مقصود یہ دکھانا تھا کہ علیؑ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جگہ لینے اور ان کی نمائندگی کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔

دوسری طرف سے کچھ لوگوں نے کوشش کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ہجرت کرنے کو ان کی فضیلتوں میں شمار کریں تاکہ یہ ہمراہی بھی کسی طرح جناب امیر علیہ الصلوۃ السلام کی قربانی سے کم نہ ہو۔ حالانکہ خود تاریخ ضبط کرتی ہے کہ ڈر اور خوف کے مارے ان کا وہ حال ہوگیا تھا کہ اگر سرور کائنات انہیں اطمینان و سکون بہم نہ پہنچاتے تو شاید وہ اس دنیا سے گزر چکے ہوتے۔

امام فخر رازی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے امیر المومنین کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر پر سونے کی مناسبت سے یہ آیہ شریفہ نازل کی۔

"و من الناس من یشری نفسہ ابتغاء مرضات اللہ"

اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو خدا کی خوشنودی
کی خاطر اپنی جان بھی داؤ پر لگا دیتے ہیں"۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ امیر المومنین کی اس عبادت سے ان کا اس دنیا سے حقیقی زہد اور ان کے خلوص اور سچی نیت کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ ساتھ ہی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کی وفاداری اور خود ان کی شجاعت اور بہادری بھی ثابت ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ آپ کو بے حد چاہتے تھے اور اسی وقت سے آپ کو خلیفہ بنانے کیلئے راہیں ہموار کرنے لگے تھے۔ یہ عنایتیں کسی صورت بھی چچا زاد بھائی ہونے کی وجہ سے نہ تھیں اس لئے کہ تعصب اور خاندان دوستی کی یہ باتیں جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات سے بہت دور تھیں۔

علیؑ اور اخوت

زیادہ تر تاریخیں لکھتی ہیں کہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ میں ہجرت سے پہلے ہی مسلمانوں کے درمیان اخوت و برادری برقرار کی تھی۔ اس سلسلے میں انہوں نے حضرت عمرؓ کو حضرت ابوبکرؓ کا، حضرت عثمانؓ کو عبدالرحمٰن ابن عوف کا اور زبیر کو عبداللہ ابن مسعود کا بھائی بنایا۔ اور جب جناب امیر علیہ السلام کے علاوہ کوئی نہیں رہ گیا تو مسلمان گویا باتیں بنانے لگے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ کو تنہا چھوڑ دیا ہے اور انہیں کسی کا بھائی نہیں بنایا۔ لیکن بہت جلد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک جملہ کہہ کر یہ مشکل حل کر دی۔ انہوں نے جناب امیر علیہ السلام سے فرمایا۔

"کیا تم راضی نہیں ہو کہ میرے بھائی بنو۔ جناب امیر علیہ السلام نے عرض کیا

کیوں نہیں اے خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ "تم دنیا و آخرت میں میرے بھائی ہو"۔

کچھ لوگ اس اخوت خصوصاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مولا علیؑ کی برادری کو باوجود اس کے کہ یہ کثرت سے روایت کی گئی ہے' ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ انہی میں ایک ابن ہشام بھی ہیں۔ ابن ہشام اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کے بعد مہاجرین و انصار میں اخوت کی بنیاد رکھی۔ یہ برادری قائم کر کے آپ مہاجر و انصار میں اسلام و ایمان کا بندھن ایجاد کرنا چاہتے تھے تاکہ تعصبی اور قبائلی رشتے کمزور پڑ جائیں اور یہ لوگ اسلام کے پرچم تلے جمع ہو جائیں۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ بھی چاہتے تھے کہ انصار معاشی مسائل میں مہاجرین کی مدد کریں۔ اس ضمن میں سیرت ابن ہشام تفصیلات ذکر کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ وہ تعلقات جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مہاجر و انصار کے درمیان قائم کرنا چاہتے تھے' وجود میں آ گئے تھے۔

اس کتاب میں کہیں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور جناب امیر المومنین کی برادری کا تذکرہ نہیں ملتا حالانکہ خود اہلسنّت کی معتبر کتاب " ریاض النضرۃ" رقم کرتی ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مولائے متقیان کو تنہا چھوڑ دیا اور کسی کے ساتھ بھی ان کی برادری برقرار نہ کی تو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا

"اے خدا کے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب کے درمیان اخوت برقرار کی اور ہمیں اکیلا چھوڑ دیا۔

جناب ختمی نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا کہ میں نے تمہیں صرف اپنے لئے رکھ چھوڑا تھا۔ تم دنیا و آخرت میں میرے بھائی ہو اور اگر کوئی پوچھے تو کہہ دینا۔

"میں خدا کا بندہ ہوں اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بھائی ہوں۔ میرے بعد جو یہ ادعاء کرے گا جھوٹا ہوگا"۔(۱)

طبرانی کی روایت کے مطابق "ریاض النضرۃ" تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہ کلمات بھی نقل کرتی ہے جو امیر المومنینؑ کے بارے میں کہے گئے ہیں۔ "قسم اس ذات کی جس نے مجھے حق پر مبعوث کیا' تمہیں میں نے صرف اپنے لئے تنہا رکھ چھوڑا تھا۔ تمہیں مجھ سے وہی نسبت حاصل ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ البتہ تم میرے بھائی ہو اور وارث ہو۔"

جناب امیر علیہ السلام نے پوچھا کہ میں کیا ورثہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لوں گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جو باقی انبیاء اپنے وارثوں کو دیتے ہیں یعنی خدا کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت۔ پھر بیٹی فاطمہ کے علاوہ تم بھی جنت کے محل میں میرے ساتھ ہوگے۔

(۱) احمد اپنی مناقب میں' متقی کنزا لعمال میں اور ابن عدی کامل میں اسے ذکر کرتے ہیں۔

علیؑ بوتراب

تاریخ امیر المومنین علیہ السلام کے اس نام سے یاد کئے جانے کے بارے میں لکھتی ہے کہ مسلمان ہجرت کے دوسرے سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سرکردگی میں ایک غزوہ پر نکلے جسے غزوہ عشیرہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس غزوہ میں لشکر کے پرچم دار حضرت حمزہؓ تھے اور ساتھ ہی مسلمانوں کی ایک جماعت تھی جس میں حضرت علیؑ ابن ابی طالب اور حضرت عمار ابن یاسر بھی تھے۔

ابن اسحاق حضرت عمار سے روایت کرتا ہے کہ وہ اس بارے میں فرماتے ہیں کہ ہم لوگ غزوہ عشیرہ کیلئے نکلے تھے۔ جب لشکر نے راستہ میں ایک جگہ قیام کیا تو ہمیں بنی مدلج کے کچھ لوگ کھیل تماشا کرتے دکھائی دیئے۔ حضرت علیؑ نے مجھ سے پوچھا اے عمار بنی مدلج کے کرتب دیکھنے چلتے ہو۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے کیا اعتراض ہو

سکتا ہے۔ ہم لوگ وہاں گئے اور ایک گھنٹہ تک یہ تماشا دیکھتے رہے یہاں تک کہ نیند ستانے لگی لہٰذا قریب ایک باغ میں جا کر سو گئے۔

آنکھ کھلی تو دیکھا سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں اٹھا رہے ہیں اس دن انہوں نے پہلی مرتبہ حضرت کو "بوتراب" یعنی خاک نشین کے نام سے یاد کیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"اے بوتراب کیا کر رہے ہو"۔

پھر انہوں نے فرمایا کیا چاہتے ہو کہ تمہیں شقی ترین لوگوں سے آگاہ کروں۔۔ ہم نے جواب دیا کیوں نہیں۔؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا سب سے زیادہ ظالم و سفاک دو اشخاص ہیں۔ ایک وہ جس نے صالح کی اونٹنی کو ذبح کیا۔ (پھر انہوں نے آپ کے سر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا)

دوسرا وہ جو یہاں وار کرے گا اور اس داڑھی کو خون سے تر کر دے گا۔

تاریخ کی مستند ترین کتاب "تاریخ طبری" میں یہ واقعہ بعینہٖ موجود ہے۔

البتہ کچھ لوگ حضرت امیرؑ کو اس نام سے یاد کئے جانے کے بارے میں ایک الگ واقعہ نقل کرتے ہیں۔

عبدالعزیز ابن حازم اپنے والد سے روایت کرتا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جب سہل ابن ساعدی جیسے بہترین مقرر سے کہا گیا کہ۔ "مدینہ کے امراء چاہتے ہیں کہ تم منبر پر بیٹھ کر علیؑ کو برا بھلا کہو اور توہین کیلئے انہیں بوتراب کے نام سے یاد کرو"۔ تو سہل نے جواب دیا کہ خدا کی قسم جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان

کا یہ نام رکھا تھا۔ جب لوگوں نے پوچھا کیسے تو سہل نے جواب دیا کہ ایک مرتبہ جناب امیر علیہ السلام گھر آئے اور گھر سے ہوتے ہوئے استراحت کیلئے مسجد چلے گئے۔ اور وہاں جاکر سو گئے۔ کچھ دیر بعد جناب ختمی مرتب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر تشریف لائے اور حضرت فاطمہ سے آپ کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ مسجد میں سو رہے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہاں تشریف لے گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ مولائے متقیان وہاں سو رہے ہیں' چادر جسم سے اتر گئی ہے اور مٹی لگی ہوئی ہے۔ انہوں نے اس حال میں دیکھ کر آپ کو بوتراب کے نام سے یاد کیا اور اسی نام سے آپ کو جگانے لگے۔

ہماری نظر میں دونوں واقعات صحیح ہیں۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلی مرتبہ اس وقت مولا علیؑ کو بوتراب کہا ہوگا جب آپ عمار ابن یاسر کے ساتھ سو رہے تھے اور جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں ان کے قاتل کے بارے میں عالم غیب سے خبر دی تھی اور فرمایا تھا کہ شقی ترین شخص وہ ہے جو تمہاری داڑھی کو تمہارے خون سے رنگین کرے گا۔ پھر اس وقت آپ کو اس نام سے یاد کیا جب آپ مسجد میں سو رہے تھے چادر جسم سے ہٹ گئی تھی اور بدن خاکی ہو گیا تھا۔

اسی سلسلہ میں ابن ہشام ابن اسحاق سے ایک عجیب سی روایت نقل کرتا ہے۔ ابن اسحاق اسے اپنے جاننے والوں میں ایک جماعت سے روایت کرتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علیؑ کو بوتراب کے نام سے یاد کرتے تھے کیونکہ جب بھی ان کے اور حضرت فاطمہؑ کے درمیان کوئی ناراضگی پیش آتی یا حضرت فاطمہ زہراؑ کوئی ایسا کام کرتیں یا کوئی ایسی چیز کہہ گزرتیں جو انہیں ناگوار گزرتی تو وہ احتراماً جناب سیدہ کو کچھ نہ کہتے۔ لیکن جب غصہ آتا تو مٹی اٹھا کر اپنے سر میں ڈالنا شروع

کر دیتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب بھی مولا کو ایسا کرتا دیکھتے تو سمجھ جاتے کہ فاطمہؑ اور آپ میں کسی بات پر اختلاف ہوا ہے۔ یوں وہ آپ کو بوتراب کے نام سے یاد کرتے۔

ہم بڑے اطمینان اور وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ روایت گھڑی گئی ہے اس لئے کہ ابن اسحاق اپنی سیرت میں عروہ ابن زبیر سے اسے روایت کرتا ہے اور عین ممکن ہے کہ یہ روایت بھی عروہ سے کی گئی ہو۔ عروہ ایک ایسا شخص تھا جو جان بوجھ کر مولا علیؑ پر جھوٹ باندھتا تھا اور اس میں اکثر وہ اپنی خالہ حضرت عائشہؓ کا حوالہ دے دیا کرتا تھا۔۔ اور حضرت علیؑ و فاطمہؑ کے بارے میں حضرت عائشہؓ کا نقطہ نظر اور ان کا سلوک کس سے ڈھکا چھپا ہے۔ جوان و کم سن ہونے کے سبب وہ چاہتی تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام تر توجہات کا مرکز بنیں جبکہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیادہ تر عنایات علیؑ و فاطمہؑ پر ہوتی تھیں۔ جس کا اعتراف وہ خود بھی کرتی ہیں۔ پھر ہم حضرت خدیجہ کے بارے میں ان کے خیالات پر تفصیلی نگاہ ڈال چکے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ جناب امیر علیہ السلام کے خلیفہ بنتے ہی انہوں نے تمام قرآنی آیات اور فرمان الٰہی کو پامال کر کے گھر سے باہر قدم رکھا اور مولا کے خلاف بغاوت کا پرچم لہرا کر اس گروہ کی سربراہی اور سرپرستی کی جس نے مسلمانوں کے خلیفہ سے جنگ کی تھی۔۔۔ لہٰذا یہ کام بھی ان سے بعید نہیں۔

پھر حضرت فاطمہؑ زہرا اپنے اس مثالی اخلاق و کردار کے ساتھ کیسے کوئی ایسا قدم اٹھا سکتی ہیں یا ایسی بات کہہ سکتی ہیں جسے وصی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پسند نہ کریں۔

علیؑ جنگ بدر میں

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا مدینہ ہجرت کرجانا ایک نئے دور کا آغاز تھا۔ وہ اس نئے شہر میں نئے اصحاب سے جاملے تھے جنہوں نے جان و مال سے آپ کی مدد اور حمایت کرنے کا عزم کیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی آمد پر انہوں نے اتنا بھرپور استقبال کیا جس کی نظیر تاریخ میں بہت کم ملتی ہے۔ روزبروز ان کے اور آپ کے تعلقات مستحکم ہو رہے تھے اور سارا شہر اسلام کی طرف بڑھ رہا تھا۔ البتہ کچھ ایسے بھی سنگ دل لوگ تھے جو اسلام کا خول چڑھا کر بت پرستی کو دل میں سجائے ہوئے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو کھلم کھلا کفر و شرک پر باقی تھے۔ مدینہ کے اطراف میں یہودیوں کی بھی ایک بڑی تعداد تھی یہ لوگ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی آمد سے ناخوش تھے اور انہوں نے آہستہ آہستہ عربوں اور قبائلی علاقہ کے

لوگوں کو مخالفت پر اکسانا شروع کر دیا تھا۔

ادھر مرسل اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت رکھ رکھاؤ ہی سے معاملات کو حل کرنا چاہتے تھے لہٰذا انہوں نے تمام چیزوں سے صرف نظر کیا لیکن ان لوگوں نے قریش کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے مدینہ پر چھاپہ مار قسم کے حملے شروع کر دیئے تھے۔ اور واضح سی بات ہے کہ اس نازک موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوئی کمزور اور بے جان موقف نہیں اختیار کرنا چاہئے تھا لہٰذا مجبوراً آپ نے بھی جوابی کارروائیاں کیں جس کی زد میں ان کے تجارتی قافلے بھی آگئے۔

ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کھلے عام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جہاد کرنے کا حکم دیا' ارشاد باری تعالیٰ ہوا۔

"اے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کی راہ میں جہاد کرو تم اپنے سوا کسی اور کے ذمہ دار نہیں ہو لہٰذا مومنوں کو جہاد کی ترغیب دو عنقریب خدا کافروں کی ہیبت توڑ ڈالے گا اور خدا کا جلال اور اس کی سزائیں اس سب سے کہیں زیادہ سخت ہیں"۔

اس حکم کے بعد کئی سرایا بھیجے گئے اور کچھ جھڑپیں بھی ہوئیں لیکن ایک بڑی اور باقاعدہ جنگ کچھ عرصہ بعد ہوئی جسے تاریخ بدر کبریٰ یا دوسری بدر کے نام سے یاد کرتی ہے۔ اس جنگ نے قریش اور دوسرے قبیلوں پر ثابت کر دیا کہ جنگوں میں کامیابیاں اسلحہ اور طاقت کے بل بوتے پر نہیں بلکہ خدا تعالیٰ پر ایمان اور عقیدے کی خاطر جانیں قربان کرنے سے حاصل ہوتی ہیں اور خدا کی کتاب کیا خوب کہتی ہے۔

"کتنی ہی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ خدا کی اجازت سے محدود اور مختصر لشکر بڑی بڑی فوجوں کو شکست دیدیتے ہیں۔" اور واقعی جنگ بدر میں بھی خدا تعالیٰ کی مرضی سے

مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ایمان والوں کو ثابت قدم رکھا اور علیؓ وحمزہ جیسے افراد کے ہاتھوں قریش کو اس ذلت و خواری سے دوچار کیا کہ کوئی گھر بھی اس داغ سے محروم نہ رہ سکا۔ اس نصرت کی دھاک یہودیوں اور دوسرے عرب قبیلوں پر بھی بیٹھ گئی تھی۔

تاریخ جنگ بدر کی تفصیلات کچھ یوں لکھتی ہے کہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے تین سو تیرہ اصحاب کے ساتھ قریش کے اس تجارتی قافلہ کے تعاقب میں نکلے تھے جو شام سے ہو کر مکہ واپس جارہا تھا۔ اتفاقاً" جب مسلمانوں کے ان عزائم کی خبر ابوسفیان کو ملی تو اس نے ہزار منتخب شدہ گھڑسواروں کا ایک جرار لشکر ترتیب دیا۔ اور اسے مدینہ کی جانب روانہ کر دیا۔ اسلحہ میں غرق اس لشکر نے بدر کی سرزمین میں پہنچ کر ہی سکون کا سانس لیا۔ جب سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان لوگوں کی آمد کی خبر ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بارے میں مسلمانوں سے صلاح و مشورہ کرنا ضروری سمجھا۔ تاریخ لکھتی ہے کہ جب سب جمع ہو گئے اور نظر خواہی کی گئی تو سب سے پہلے حضرت عمر کھڑے ہوئے۔ انہوں نے قریش اور ان کے بھیجے ہوئے لشکر کی شان و شوکت پر شاندار تقریر کی اور مسلمانوں کو ان سے جنگ نہ کرنے کی نصیحت کی۔ حضرت عمر کے بعد مقداد اور پھر سعد ابن معاذ کھڑے ہوئے۔ان دونوں نے مسلمانوں کی اکثریت کی نمائندگی کرتے ہوئے بارگاہ رسالت میں عرض کیا۔

"اے خدا کے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ رب العزت کے حکم پر عمل درآمد شروع کر دیجئے ہم آپ کے ساتھ ہیں آپ ہمیں جہاں کہیں بھی لے جائیں گے اپنے ساتھ ہی پائیں گے۔ اور ہم کبھی بھی بنی اسرائیل کی بھیڑوں کی طرح یہ بات

زبان سے نہیں نکالیں گے کہ

"ہم یہاں بیٹھے ہیں تم اپنے خدا کے ساتھ جا کر جنگ لڑو"۔

ان دونوں اصحاب کی زبردست تقریر سن کر اور ان کا عزم و جزم دیکھ کر رسول عرب و عجم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسکرائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں میں سے دو تین افراد کو قریش کے بارے میں مزید اطلاعات بہم پہنچانے پر مامور کر دیا۔ یہ لوگ سرزمین بدر کے آس پاس کے علاقوں میں گئے اور قریش کے دو غلاموں کو پکڑ لائے جن سے قریش کی صحیح جنگی طاقت کا اندازہ ہوا۔

اس سے پہلے کہ جنگ شروع ہوتی جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قریش کو خون خرابہ سے ڈرایا اور انہیں احساس دلایا کہ وہ کس سے لڑ رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شیریں گفتار قریش کے بہادر اور تجربہ کار جرنیل عتبہ کے دل میں اتر گئی اور اس نے قریش کو جنگ سے باز رکھنے کی کافی کوشش کی لیکن اقتدار کے نشہ میں چور ابوجہل کو قریش کی اتنی بڑی تعداد پر گھمنڈ ہو گیا تھا لہٰذا وہ عتبہ کو بزدلی کے طعنے دینے لگا جسے غلط ثابت کرنے کیلئے عتبہ اپنے بھائی شیبہ اور بیٹے ولید کو میدان جنگ میں لے آیا جو قریش کے زبردست اور نامی گرامی پہلوان سمجھے جاتے تھے۔ جب مسلمانوں کی طرف سے جماعت انصار میں سے تین جواں مرد ان کے مقابلہ پر گئے تو انہوں نے ان سے لڑنے سے انکار کر دیا اور جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے چاہا کہ خود قریش سے ان کے ہم وزن لوگوں کو مقابلہ پر بھیجیں۔ یہ سننا تھا کہ پیغمبر عرب و عجم نے ایک مرتبہ اپنے چچا زاد بھائیوں کی طرف دیکھا گویا کہ ان کے وجود سے آپ کو ڈھارس تھی اور شاید وہ لوگ بھی آپ کا ہاتھ بڑے شوق اور ولولہ سے بٹاتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا'

"اے عبیدہ ابن حارث' اے حمزہ ابن عبدالمطلب اور اے علی ابن ابی طالب اٹھیے!۔"

اس آواز کا سننا تھا کہ یہ لوگ مسکراتے چہروں کیساتھ بجلی کی سی تیزی سے اٹھے اور اس انداز سے دشمن کے مقابلے پر گئے کہ ان کے جسموں میں ایمان کی حرارت اور یقین کی کھنک تھی۔ ان کے دل مطمئن اور پرسکوں تھے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس مشن میں اپنا سب کچھ لٹا دینا ان کی آرزو تھی۔ اور بہرحال اس میں شک نہیں کہ اگر ہاشمیوں کی قربانیاں اور خدمات نہ ہوتیں تو اسلام اپنے آغاز ہی میں شکست سے دوچار ہو جاتا۔

خود بدر کی جنگ میں وہ پہلی اور کاری ضرب جس نے پانسہ پلٹ دیا اور کفار کی امیدوں پر پانی پھیر دیا انہی چچازاد بھائیوں کے ہاتھوں لگی تھی۔

یہ لوگ جب آگے بڑھے تو عتبہ ان لوگوں کو آتا دیکھ کر خوش ہو گیا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ حضرت عبیدہ عتبہ کے مقابلے پر حضرت حمزہ شیبہ کی ٹکر پر' اور حضرت علیؑ ولید سے لڑنے کیلئے گئے۔ حضرت حمزہؓ نے اپنے حریف کو موقع دیئے بغیر ہی زیر کر لیا اور اسی طرح مولائے متقیان نے بھی بہت جلد ولید کو واصل جہنم کیا لیکن حضرت ابو عبیدہ اور عتبہ درگیر رہے اور دونوں ایک دوسرے کو زخمی کر چکے تھے۔ حیدر کرار نے جو اپنے چچا زاد بھائی کا یہ حال دیکھا تو ان کی مدد کو گئے اور ایک ہی ضربت میں عتبہ کو دو ٹکڑے کر کے انہیں نجات دی۔ آپ پھر حضرت حمزہ کی مدد سے حضرت ابو عبیدہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور لے گئے وہاں پہنچ کر انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا میرا نام بھی شہیدوں میں ہے حضور والا مقام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا کہ کیوں نہیں۔ یہ سننا تھا کہ ان کی خوشی

کی انتہاء نہیں رہی اور کچھ عرصہ بعد ہی زخموں کی تاب نہ لاکر وہ شہادت کے درجہ پر فائز ہو گئے۔ وہ مسلمانوں کے درمیان پہلے شہید تھے۔

ادھر قریش نے ان پہلوانوں سے مایوس ہو کرحنظلہ ابن ابی سفیان کو بھیجا۔ لیکن شیر خدا نے ایک ہی ضربت میں اسے بدر کی ریت پر نیند کی موت سلا دیا۔ اس کے بعد عاص ابن سعید ابن عاص اور دوسرے پہلوان بھی آئے لیکن آپ نے انہیں بھی واصل جہنم کیا۔

اپنے سرداروں کا یہ حال دیکھ کر قریش پر عجیب وحشت طاری ہو گئی اور ڈر کے مارے انہوں نے ابوجہل کو حفاظت کی غرض سے گھیرے میں لے لیا۔ اور بعد میں بھی کچھ لوگوں کو بھیجا جو حیدر کرار اور حضرت حمزہ کے تہ تیغ آتے رہے۔ اور پھر جنگ بھرپور انداز میں شروع ہو گئی اور دونوں فوجیں ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں۔

مشہور مورخ ابن ہشام اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ مسلمان قریش کی فوجوں پر بڑھ چڑھ کر حملہ کر رہے تھے جن میں حضرت علیؑ و حمزہ پیش پیش تھے لیکن کہیں بھی حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کا ذکر نہیں ملتا جو سائبان میں جناب رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ موجود تھے۔۔ جب خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں اور قریش کے حوصلہ پست ہو رہے تھے تو جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سائبان سے باہر نکلے آپ نے خدا سے دعا کی کہ کفار کے دلوں کو مسلمانوں کے رعب و دبدبے سے بھر دے۔ اور پھر ایک پتھر اٹھایا اور اسے قریش کی طرف پھینک دیا جس کے فوراً بعد وہ لوگ پسپا ہو گئے' ان کے سپاہی اسلحہ چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کامیابی کی نوید یوں دی۔

"اس وقت کو یاد کرو جب خدا ملائکہ کو وحی کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں

لہٰذا مومنوں کو ثابت قدم رکھو۔ بہت جلد میں کفار کے دل میں رعب و دبدبہ ڈال دوں گا۔ لہٰذا انہیں مارڈالو اور نیست و نابود کر دو اس لئے کہ انہوں نے خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے خلاف اعلان جنگ کیا ہے اور جو لوگ خدا اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے عداوت کرتے ہیں وہ جان لیں کہ خدا بہت سخت سزا دینے والا ہے۔

شیعوں میں سے شیخ مفید اور اہلسنت کے دانشمند واقدی اور عبدالفتاح لکھتے ہیں کہ جنگ بدر صد در صد مسلمانوں کے حق میں تھی۔ اور جتنے لوگ مرے ان میں سے آدھے صرف شیر خدا کی تلوار سے کیفر کردار کو پہنچے اور باقی کا دوسرے مسلمانوں نے کام تمام کیا۔

اہلسنت کے دانشمند امام سیوطی اپنی تفسیر کی کتاب در منثور میں اس آیہ شریفہ کو نقل کرتے ہیں۔ "کیا ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور عمل صالح انجام دیئے ان کی طرح سمجھیں جو زمین پر فساد پھیلاتے ہیں"۔ اور اس کے ذیل میں رقم کرتے ہیں کہ ابن عساکر ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آیہ شریفہ میں عمل صالح انجام دینے والوں سے مراد علی ابن ابی طالب و حمزہ و ابو عبیدہ ابن حارث ہیں جبکہ مفسدین کے صحیح مصداق عتبہ و شیبہ و ولید ہیں۔

"ذخائر عقبی" "ریاض النضرۃ" اور قزوینی کی "فضائل خمسہ" میں امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ بدر کی جنگ کے دن ملائکہ پکار رہے تھے۔ "لاسیف الا ذوالفقار و لا فتی الا علیؑ" تلواروں میں صرف ذوالفقار ہے اور جواں مردوں میں صرف علیؑ ہیں۔ خود "فضائل خمسہ" طبری جیسے مشہور مورخ سے فاتح خیبر کی شجاعت تفصیل سے نقل کرتی ہے اور یہ بھی رقم کرتی ہے کہ اس دن یہ آواز بھی سنی

گئی کہ "لا سیف الا ذوالفقار و لا فتیٰ الا علی"

بہرحال مورخین اور دانشمند بدر کی جنگ میں امیر المومنین کی شجاعت اور دلیری کا تذکرہ کھل کر کرتے ہیں اور سوائے ہیکل جیسے متعصب افراد کے کوئی آپ کی ان بے بہا خدمات سے چشم پوشی نہیں کرتا۔

علیؑ جنگ احد میں

احد کی جنگ ۳ ہجری میں ہوئی۔ اس جنگ میں جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ہدایات پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے مسلمانوں کو بڑی شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس میں شک نہیں کہ جنگ بدر نے قریش سے سکھ و اطمینان چھین لیا تھا اور پورے شہر کو غم و رنج میں ڈبو دیا تھا۔ جس شہر کے نوجوان اور پہلوان قبرستانوں کی زینت بن گئے تھے وہ شہر اتنا داغدار اور سنسان ہو گیا تھا کہ اس نے اپنی عورتوں تک کو چیخنے اور رونے سے منع کر دیا تھا لیکن کچھ عرصہ بعد خود یہ لوگ بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے تھے اور عورتوں کو نوحہ خوانی کیلئے بلواتے تھے۔ شاید اس لئے کہ یہ گریہ وزاری جذبات کو بھڑکاتی اور انتقام کی اس آگ کو مزید شعلہ ور کرتی تھی جو ان کے سینوں میں بھڑک رہی تھی۔ ساتھ ساتھ یہ لوگ جنگ کی تیاریوں میں مصروف

تھے۔ لہٰذا ایک سال کی بھرپور تیاری کے بعد انہوں نے یہودیوں کو اپنا ہم پیمان بنایا' اسلام دشمنوں کو یکجا کیا اور آس پاس کے تمام قبیلوں کو ساتھ ملا کر مدینہ پر چڑھائی کا پروگرام بنایا۔ بظاہر عباس ابن عبدالمطلب بھی ان کے ساتھ دکھائی دیتے تھے لیکن وہ ان کے درمیان رہ کر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قریش کے عزائم سے آگاہ کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا پروگرام فائنل ہونے پر انہوں نے تمام اطلاعات خفیہ طور پر بہم پہنچائیں اور سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی وقت سے تیاریاں شروع کردیں۔

ادھر قریش اسلحہ میں غرق' تین ہزار کے لشکر کو لے کر مدینہ کیلئے روانہ ہو گئے ان میں پچیس عورتیں بھی تھیں جن میں ابوسفیان کی بیوی اور عتبہ کی بیٹی ہند بھی دکھائی دیتی تھی۔ یہ لوگ جب "ابواء" کے مقام پر پہنچے اور گزر جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی والدہ ماجدہ کی قبر سے ہوا تو انتقام اور نفرت کے جذبات ابھر آئے اور انہوں نے چاہا کہ قبر کو کھودیں اور لاش کو جلا کر راکھ کا ڈھیر کر دیں لیکن قریش کے بزرگ ڈرتے تھے کہ کہیں یہ غلط رسم خود قریش میں نہ رخنہ ڈال لے۔ لہٰذا انہوں نے ان نوجوانوں کو اس کام سے روک لیا۔ یہاں سے آگے بڑھ کر انہوں نے سفر جاری رکھا اور "سفح جبل" کے مقام پر قیام کیا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان لوگوں کے آنے کی خبر ہوئی تو آپ نے مسلمانوں کو جمع کر کے درپیش خطرے سے آگاہ کیا اور اس بارے میں ان سے صلاح و مشورہ کرنا ضروری سمجھا۔ مسلمانوں کی آراء مختلف تھیں۔ روایات صراحت سے بیان کرتی ہیں کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زیادہ تر مسلمانوں کا نقطہ نظر دریافت کر لیا تو ان سے خطاب کیا۔ انہیں صبر و ضبط کی تلقین کی اور یقین دلایا کہ اگر

وہ بے جگری سے لڑیں گے اور ڈٹے رہیں گے تو کامیابی ان کے قدم چومے گی۔

بہرحال آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان لوگوں کو لیکر شہر سے باہر نکلے جو ہزار کے لگ بھگ تھے۔ ابھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہر کی حدود سے باہر ہی نکلے تھے کہ منافقوں کا سردار عبداللہ بن ابی اپنے تین سو ساتھیوں کو واپس لے کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جدا ہو گیا۔

جبکہ ایک روایت کے مطابق مسلمانوں کی تعداد سات سو تھی لیکن جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ سے نکلنے لگے تو خبر ملی کہ عبداللہ ابن ابی کے ہم پیمان یہودی جو تین سو کی تعداد میں تھے' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہمراہی کرنا چاہتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ کہہ کر انہیں واپس کر دیا کہ

"ہم شرک کے مقابلہ میں مشرکوں کی مدد نہیں لیا کرتے"۔

نتیجتاً" آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہی سات سو اصحاب پر اکتفا کیا اور احد کے مقام تک پیشقدمی کی۔ یہاں پہنچ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو تیار کیا اور صفوں کو صحیح انداز میں ترتیب دیا۔ نیز پشت پر موجود ٹیلہ پر پچاس تیر انداز نصب کر دیئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں سختی سے ہدایت کر دی کہ اگر کفار حملہ کریں تو انہیں تیر باران کرنا لیکن مسلمانوں کے جنگ جیتنے کی صورت میں بھی مورچے خالی نہ کرنا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پورے لشکر کو اس طرح ترتیب دیا جو عسکری تنظیم کا اعجاز ہے۔

ادھر قریش نے اپنا پرچم بنی عبدالدار کے خاندان کو سونپا اور ان کے درمیان سے طلحہ بن طلحہ نامی پہلوان آگے بڑھا اور اس نے اپنا مدمقابل طلب کیا۔ مسلمانوں کی جانب سے مولائے کائنات اس کے مقابلہ پر گئے۔ آپ نے بڑھ کر تلوار کی ایک ایسی ضربت

لگائی کہ خون میں نہا کر وہ واصل جہنم ہوا۔ اس کے مرتے ہی اس کا بھائی عثمان بن طلحہ رجز پڑھتا ہوا آگے بڑھا اور پرچم ہاتھ میں اٹھا لیا۔ اس کی پشت پر عورتیں دف بجا رہی تھیں اور گا گا کر اپنا تعارف کرا رہی تھیں۔ وہ حسن کے اظہار کے ساتھ قریش کے سپاہیوں سے یہ کہہ رہی تھیں۔

"اگر ڈٹے رہے تو بانہوں میں لیں گے اور بھاگ گئے تو شکل بھی نہ دیکھیں گے۔"

عثمان بن طلحہ پرچم لے کر آگے بڑھا ہی تھا کہ حضرت حمزہؓ اس کی دادرسی کیلئے گئے اور اس کا کام تمام کیا۔ جب تیسرا بھائی آیا تو اس دفعہ خدا کے شیر حضرت علیؑ آگے بڑھے۔ آپ نے نہ صرف اسے بلکہ اس گروہ کے آٹھ نو افراد کو موت کے گھاٹ اتارا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ پرچم اٹھانے والے گروپ میں بنی عبدالدار کے خاندان کے نو افراد تھے جنہیں صرف حضرت امیر علیہ السلام نے کیفر کردار تک پہنچایا۔ (۱)

زیادہ تر روایتوں میں ہے کہ جب اس گروپ کے تمام افراد مارے گئے تو جو بھی اس جھنڈے کو اٹھانے کی غلطی کرتا' ذوالفقار کی زد میں آجاتا۔ یہ سلسلہ اس حد تک جاری رہا کہ کسی میں اس گرے ہوئے پرچم کو اٹھانے کی جرات نہ رہی۔ خوف و ہراس پورے لشکر پر چھا گیا۔ اور قریش کی عورتیں بھی مسلمان فوجوں کی دسترس میں آگئیں البتہ انہوں نے صنف نازک پر ہاتھ اٹھانا مناسب نہ سمجھا۔

نہج البلاغہ کی شرح میں واقدی کے یہ کلمات نقل کئے گئے ہیں "وہ کامیابی جو خدا وند عالم نے احد کی جنگ میں مسلمانوں کو عطا کی تھی شاید وہ کسی اور جنگ میں انہیں

---

(۱) یہی چیز تاریخ ابن اثیر' ارشاد مفید' تاریخ طبری اور تفسیر قمی میں بھی ملتی ہے۔

نصیب نہ ہوتی لیکن بدقسمتی سے انہوں نے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام کی خلاف ورزی کی اور مال غنیمت کی طرف لپک گئے۔"

ادھر ان تیر اندازوں نے جب قریش کے سپاہیوں کو فرار ہوتے اور اپنے بھائیوں کو مال غنیمت کی طرف دوڑتے دیکھا تو انہوں نے بھی خلاف ورزی کا یہ سلسلہ جاری رکھا اور مورچے خالی کر دیئے۔ اور آٹھ نو افراد کے علاوہ وہاں کوئی باقی نہ بچا۔

قریش کو شکست ہو چکی تھی۔ وہ واپس ہو رہے تھے کہ اچانک ان میں سے ایک تجربہ کار جرنیل خالد بن ولید کی تند و تیز نگاہ اس چوٹی پر پڑی اور خلاف معمول اس نے ان چند افراد کے سوا اسے خالی پایا۔ اس نے موقع مناسب جان کر دو سو سپاہیوں کے ساتھ وہاں سے مسلمانوں پر حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ ادھر جب ان لوگوں نے دشمن کو حملہ کرتے اور اپنی طرف آتے دیکھا تو پہلے تو انہیں خوب تیرباران کیا اور جب وہ لوگ بالکل نزدیک آ گئے تو تلواریں نکال لیں اور جنگ کرتے ہوئے عزت کے ساتھ موت کی نیند سو گئے۔۔ خالد نے ان سے فارغ ہو کر جب پیٹھ پیچھے سے ان لوگوں پر حملہ کیا جو دنیاوی چیزیں سمیٹنے میں مصروف تھے تو چاروں طرف سے دشمن کو آتا دیکھ کر وہ گھبرا گئے اور تمام قدریں طاق نسیاں میں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس دوران امیر المومنین علیہ السلام کی تمام تر توجہات پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مرتکز تھیں۔ ہر سمت سے ان پر حملے ہو رہے تھے اور آپ کی انتھک کوششوں کے باوجود وہ کچھ زخم لگنے کے باعث بیہوش ہو گئے تھے۔

شیخ مفید اپنی کتاب "ارشاد" میں ابن مسعود کی یہ روایت رقم کرتے ہیں کہ صرف مولائے کائنات علیہ السلام' ابو دجانہ اور سہل بن حنیف جنگ احد مین ثابت قدم رہے اور آخری وقت تک پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہمراہی کرتے رہے۔

ان لوگوں نے جناب خاتم النبین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گھیرے میں لے لیا تھا اور دشمن کے حملوں کو دفع کر رہے تھے۔۔۔ جب جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہوش آیا اور انہوں نے جناب امیر علیہ الصلوۃ والسلام سے لوگوں کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ انہوں نے اپنے کئے ہوئے وعدوں کا احترام نہ کیا اور جنگ کے میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اور اسی انتشار کو دیکھ کر عرب کے بدو کبھی فرداً فرداً اور کبھی ٹولیوں کی صورت میں خدا کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حملے کرتے تھے اور اگر اس وقت علیؑ بے جگری کا ثبوت نہ دیتے تو انہیں بچانا مشکل ہو جاتا۔

شیر خدا نے جان کی بازیاں لگا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف اٹھنے والے ہر ہاتھ اور بڑھنے والی ہر تلوار کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اور اس وقت جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ساتھ دیا جب زیادہ تر مسلمان اور اصحاب ان سے مایوس ہو چکے تھے۔ آپ نے صرف بنی سفیان بن عوف کے واحد خاندان سے صرف دس آدمیوں کو تہ تیغ کیا۔ اس بہادری اور شجاعت کو دیکھ کر فرشتے بھی دنگ رہ گئے اور جبرئیل امین نے بارگاہ رسالت میں دست بستہ عرض کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس جانثاری اور فداکاری پر تو فرشتے بھی حیران ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ علیؑ کیونکر ایسے نہ ہوں جبکہ وہ ہم سے ہیں اور ہم ان سے۔ جبرئیل نے کہا کہ اور میں آپ دونوں سے ہوں۔"

اسی دن جب "لاسیف الاذوالفقار ولا فتی الاعلی" کی آوازیں سنائی دیں اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ جبرئیل ہیں۔

یہ حدیث راویوں کی ایک جماعت سے موصول ہوئی ہے اور علماء کے نزدیک یہ مشہور احادیث میں سے ہے۔

اس بارے میں نہج البلاغہ کی شرح کے مصنف رقمطراز ہیں کہ' "میں نے مغازی بن اسحاق کے بعض نسخوں کا مطالعہ کیا اور اپنے استاد عبدالوہاب بن سکینہ سے دریافت کیا کہ کیا یہ حدیث صحیح ہے۔۔؟ جب انہوں نے اقرار کر لیا تو میں نے مزید پوچھا کہ پھر کیوں صحاح ستہ میں اسے نقل نہیں کیا گیا۔۔؟

انہوں نے بھی سوالیہ انداز میں پوچھا کہ کیا صحاح ستہ میں تمام صحیح احادیث کو جمع کر لیا گیا ہے۔۔!!! پھر فرمانے لگے کہ حقیقت یہ ہے کہ ان کتابوں کے لکھنے والوں نے بہت سی صحیح احادیث کو نظر انداز کیا"۔

صحاح ستہ کے برخلاف اہلسنّت کی دوسری معتبر کتابیں جن میں ریاض النضرۃ (ج ۲)' مرقات علی بن سلطان' مناقب احمد' ہیثمی کی مجمع الزوائد اور تاریخ طبری وغیرہ شامل ہیں' اسے نقل کرتی ہیں۔

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لکھنے والے متفق ہیں کہ جو مثالی کردار علیؑ احد میں پیش کر گئے اس کی نظیر بھی انسانیت کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ وہ اپنی ذات کو بھلا کر خدا کے رسول کی حفاظت میں مگن تھے۔ ان کے شانے خون سے سرخ تھے اور تلوار میں بجلی کی سی تیزی تھی۔ جو پہلوان ان کے نزدیک آتا جہنم کا ایندھن بن جاتا اور جو گروہ ان سے ٹکراتا پاش پاش ہو جاتا۔

اس جنگ میں حضرت حمزہ نے بھی تلوار کے کافی جوہر دکھائے۔ جہاں تک اور لوگوں کا تعلق ہے اس بارے میں مشہور مورخ طبری اپنی تاریخ میں ابن اسحاق کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ حضرت انس نے حضرت عمر اور طلحہ بن عبیداللہ سے پوچھا کہ تم

لوگ یہاں کیوں بیٹھے ہو۔؟

انہوں نے یہ جواب دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہید کر دیئے گئے ہیں۔ اس پر انس نے یہ کہا کہ جاؤ اسی راہ میں جان دے دو جس مشن کی تکمیل کیلئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہید ہوئے تھے۔ جب کسی نے بھی کوئی حرکت نہ کی تو وہ تنہا اٹھے' میدان جنگ کی طرف بڑھے اور بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔

اس چیز کو خود طبری اپنی اسی تاریخ کی تیسری جلد کے ص ۳ پر مختلف انداز سے لکھتے ہیں۔ وہ اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ لوگوں میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرنے کی افواہ پھیل گئی تھی اور ڈر کے مارے وہ پہاڑیوں پر چڑھ گئے تھے۔ انہی لوگوں میں حضرت ابوبکر و عمر بھی تھے۔ ان میں سے کسی نے یہ جملہ کہا کہ "اے کاش کوئی ہوتا جو عبداللہ بن ابی کے ذریعے ابوسفیان سے ہماری وساطت کرا دیتا۔۔ اے لوگو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مارے جا چکے ہیں اور اس سے پہلے کہ دشمن تمہارا تہس نہس کرے' واپس ہو جاؤ"۔

جب انس کے کانوں میں یہ آواز گئی تو انہوں نے لوگوں کے ضمیروں کو جھنجوڑا اور انہیں رسالت کے مقصد پر مرمٹنے کی تاکید کی۔

تاریخ ضبط کرتی ہے کہ حضرت انس کے جسم پر ستر ضربتیں وارد ہوئیں اور اگر ان کی بہن ان کی شناخت نہ کراتیں تو انہیں پہچاننا مشکل ہو جاتا۔

کچھ مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ آیہ شریفہ جنگ احد کے موقع پر نازل ہوئی۔

"محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو صرف رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی بہت سے انبیاء و مرسلین گزر چکے ہیں پس اگر وہ وفات پا گئے یا مار دیئے گئے تو تم لوگ پیٹھ کر لو

گے اور جو ایسا کرے گا وہ خدا کا بال بھی بیکا نہ کر سکے گا۔"

جہاں تک حضرت ابوبکرؓ کا تعلق ہے طبری کی روایت نہ یہ تصریح کرتی ہے کہ انہوں نے جنگ سے فرار کیا اور نہ رقم کرتی ہے کہ انہوں نے جنگ میں حصہ لیا۔ لیکن نہج البلاغہ کی شرح میں یہ مرقوم ہے کہ جب مشرکین کی طرف سے عبدالرحمٰن بن ابی بکر نے اپنا مدمقابل طلب کیا اور حضرت ابوبکرؓ نے جناب رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مقابلہ کرنے کی اجازت چاہی تو انہوں نے یہ کہہ کر روک دیا کہ "بیٹھو ہم تمہاری زندگی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں"۔ البتہ حضرت عثمان کے بارے میں یہی تاریخ طبری رقم کرتی ہے کہ وہ دو افراد کے ساتھ میدان جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے اور خوف سے چہروں کو بھی چھپا لیا تھا۔

بہرحال اس میں کسی کو تامل نہیں کہ کم و بیش زیادہ تر اصحاب میدان جنگ سے جا چکے تھے اور مولائے کائنات اور ایک دو اصحاب کے علاوہ کوئی باقی نہیں رہا تھا۔ اور جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بلانے پر بھی کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جواب نہیں دیا۔

قریش کے ساتھ اس دوسری جنگ میں سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے قریبی دوستوں سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔ انہی میں حضرت حمزہ سرفہرست تھے۔ انہیں ایک ایسے سیاہ فام حبشی نے شہید کیا جسے خاص طور پر ابوسفیان کی بیوی نے اس کام کیلئے مامور کیا تھا۔

شہادت کے بعد بھی ان لوگوں نے اس وحشت گری کو جاری رکھا اور نہ تنہا ہند بلکہ ابو سفیان نے بھی حضرت حمزہ کے کلیجہ کو چبایا۔ (۱)

مصر کے مشہور دانشور استاد عبدالفتاح لکھتے ہیں کہ علیؑ اور اولاد علیؑ کی دشمنی و

---

(۱) استاد عبدالفتاح (۲) واقدی کا ادعاء

عداوت کا ثبوت نصف صدی کے گزرنے سے پہلے ہی مل جاتا ہے جب ابو سفیان کا پوتا یزید اپنے دادا کے نیزے کی جگہ اپنے ہاتھ کی چھڑی سے سرور شہیداں حسین ابن علیؑ کے مبارک ہونٹوں سے گستاخی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ دراصل یہ اس کے خاندان کی ساخت تھی۔

یہی وجہ ہے کہ تاریخ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ردعمل اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قہر آمیز تاثرات بڑی تفصیل سے قلمبند کرتی ہے۔

جب جنگ ختم ہوئی اور مرسل اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت امیر کے ہمراہ واپس ہوئے تو جناب سیدہ نے دوسری خواتین کے ہمراہ آپ کا استقبال کیا۔ (۲)

البتہ شیخ مفید کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدینہ پہنچنے پر انہوں نے آپ کا استقبال کیا۔

ابن اثیر نقل کرتا ہے کہ حضور والا مقام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جسم زخمی تھا۔ مولائے کائنات پانی ڈال کر زخموں کو دھو رہے تھے اور خون کسی صورت نہیں رک رہا تھا۔ جناب سیدہ آئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حالت دیکھ کر رونے لگیں۔ ان کا زخموں پر ہاتھ لگنا تھا کہ خون رک گیا۔

اسی طرح پیغمبر اکرم کے وارث اور وصی کا ہاتھ خونی تھا اور تلوار سرخ تھی۔ لیکن پھر بھی غزالی جیسے متعصب لوگ آپ کی جانثاری اور فداکاری کے اس مثالی کردار کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ اور آپ کا نام لینا بھی مناسب نہیں سمجھتے۔ حالانکہ اگر یہ گراں بہا خدمات نہ ہوتیں تو اسلام کا نام و نشان بھی مٹ جاتا۔

Zucchini

500g minced steak
1 small onion grated
3 small (185g) Zucchini grated

1 tea spoon Soy sause
1 " grated green ginger

1 egg yolk

6 ham burger

1 tamato sliced

1 onion sliced extra lettuce

combined minced steak, onion plate, zucchini, soy sauce, ginger and egg yolk, shape into 6 patties

Barbecue on lightly oiled plate until done. Serve on toasted, buttered buns with tomato & extra and lettuce

Make 6 burgers

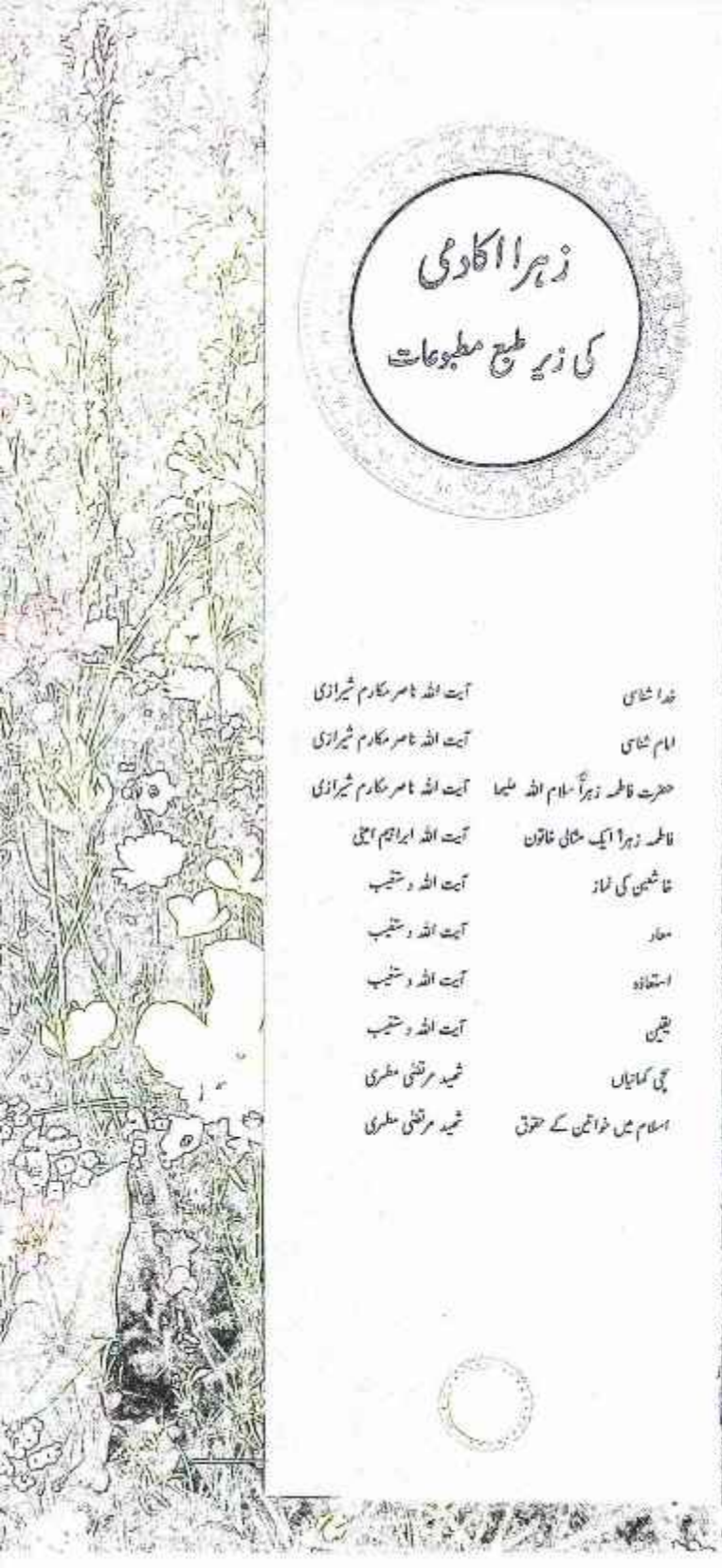

زہرا اکادمی

کی زیر طبع مطبوعات

خدا شناسی	آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی
امام شناسی	آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی
حضرت فاطمہ زہراؑ سلام اللہ علیہا	آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی
فاطمہ زہراؑ ایک مثالی خاتون	آیت اللہ ابراہیم امینی
خاشعین کی نماز	آیت اللہ دستغیب
معاد	آیت اللہ دستغیب
استعاذہ	آیت اللہ دستغیب
یقین	آیت اللہ دستغیب
سچی کہانیاں	شہید مرتضیٰ مطہری
اسلام میں خواتین کے حقوق	شہید مرتضیٰ مطہری